حکمتِ تبلیغ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتبہ
سید اسعد گیلانی

فہرست مضامین

آزمائش اور استقامت

حکمتِ تبلیغ

داعئ حق اور اُس کے اوصاف

داعئ حق کے اوصاف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

حرفِ اوّل

تبلیغ کارِ انبیاء ہے اور انسانی نفسیات اور فہم و شعور سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ انسانی فہم و شعور میں ایک بات کس پیرائے میں پیش کر کے بٹھائی جائے اور کس نفسیاتی طرزِ عمل کا لحاظ رکھا جائے تبلیغ کا یہی موضوع اور فن ہے۔ مبلّغ کا کام انسان سازی کا کام ہے اور اس کام میں اس کے علم اور حکمت دونوں کا استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو جنہیں اپنے بندگان کی اصلاح کے لیے مامور کیا انہیں حکمت تبلیغ کی کیسی کیسی عمدہ باتیں بتائیں اور کس کس نفسیاتی طریقہ کا اہتمام و التزام کرنے کی تلقین کی، قرآن میں اس کی بیشمار مثالیں موجود ہیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک تو حکمتِ تبلیغ کا بہترین مثالی نمونہ ہے۔

ہم نے اس کتاب میں قرآن میں بیان کردہ ان طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بنیاد تفہیم القرآن کو بنایا ہے البتہ مولانا ابُوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریچر میں سے بھی بعض بعض اقتباسات اپنی تبلیغی اہمیت کے پیشِ نظر اخذ کیے گئے ہیں۔

کتاب کے چار حصّے ہیں اور چاروں حصّوں کے مضامین کا تعارف کرانے کے لیے ایک ایک ابتدائیہ تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ابتدائیے اگرچہ طویل بھی ہیں اور مؤلف کے تحریر کردہ ہونے کے سبب کتاب کے اقتباسات میں بظاہر ایک بے جا اضافہ بھی ہیں، لیکن مضمون کی مناسبت سے ان کی حیثیت تعارف مضمون کی بن گئی ہے اور یہ ابتدائیے ہر مضمون کی

خصوصیت کو اُجاگر کرنے میں ایک قابلِ لحاظ خدمت سر انجام دیتے ہیں۔

میں نے یہ کتاب مرتب کرنے کا نقشہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ کی زندگی میں ہی بنایا تھا اور انہوں نے اس خیال کو پسند کیا تھا کہ مبلغین کے لیے تفہیم القرآن کی مدد سے حکمت تبلیغ پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔ چنانچہ میں نے اس کام کا آغاز ان کی زندگی میں ہی کر دیا تھا۔ پھر یہ کام بتدریج اور آہستہ آہستہ آگے ---بڑھتا رہا اور بالآخر اس نے ایک کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

اس کتاب کی ترتیب میں سب سے زیادہ حصہ میرے محترم اور بزرگ دوست مولانا محمد عبداللہ علوی مہتمم مدرسہ قاسم العلوم سرگودھا کا ہے۔ انہوں نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے خود بھی اور اپنے مدرسہ کے منتہی طلبہ سے بھی تفہیم القرآن میں سے ایسی آیات چھانٹنے اور ان کی تشریحات نقل کرنے کا کٹھن کام سر انجام دیا۔ اگر وہ یہ مدد نہ کرتے تو اس کتاب کی تکمیل کا ابھی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس خدمت کا بہترین اجر آخرت میں عطا فرمائے اور کارکنانِ تحریک اسلامی کی تبلیغی سرگرمیوں کے اجر میں ان کا حصہ بھی شمار کیا جائے۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو کارکنانِ تحریکِ اسلامی اور مبلّغین اسلام کے لیے قابلِ قدر گائیڈ بک بنائے اور انہیں اس سے بہترین استفادے کی توفیق دے۔

اسعد گیلانی

منصورہ۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء

دعوتِ دین

دعوتِ دین

ابتدائیہ[1]

اول روز سے انسان کو اجتماعی زندگی کے بنیادی اصول اللہ کے فرستادہ قائدینِ انسانیت، انبیاء کرام کے ذریعے سکھائے جاتے رہے ہیں اور وہی انسانیت کے راست باز اور راست رو قائد تھے۔ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً انہیں اس کام پر مامور کرتا رہا تاکہ وہ قافلۂ انسانیت کو راہِ راست سے نہ بھٹکنے دیں، انبیاء کرام کا سکھایا ہوا راہِ راست ہی صراطِ مستقیم اور دینِ حق ہوتا ہے۔ اس سے ہٹا ہوا راستہ ہی باطل اور گمراہی کا راستہ ہوتا ہے، جو انسان کو دُنیا میں تباہی سے اور آخرت میں خسران سے دوچار ہے۔

انبیاء کرام اپنے اپنے معاشروں میں ہمیشہ اپنا پیغام ایک عمومی دعوت اور تحریک کی صورت میں لے کر اُٹھتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ معاشرے میں ہدایت اور راستی کی رو چلانے کی کوشش کی، انبیاء کی برپا کردہ تحریکیں ہر دور میں اسلامی تحریکیں تھیں اور وہ بھی اسلامی تحریکیں ہی تھیں جو انہیں خطوط پر انہیں مقاصد کے لیے انبیاء کے پیروکاروں کے ذریعے برپا کی جاتی رہی ہیں تاکہ انسانیت کو اس کے خالق کی طرف رہنمائی کرنے کا اہتمام کیا جائے، انبیاء کرام کے مقاصدِ دعوت سے ہٹ کر انسانی معاشرے میں جو تحریکیں اُٹھتی ہیں وہ باطل مقاصد کے لیے ہوتی ہیں، اور ان سے انسانیت کو مجموعی طور پر

---

[1] ابتدائیہ از سید اسعد گیلانی

بہت نقصان پہنچتا ہے، انبیاء کرام اور ان کے پیرو کار صالحین کی دعوت ہر دور میں یکساں رہی ہے۔ یہ دعوت تین نکات پر مشتمل رہی ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عام کیا جائے اور اس کے حکم سے سرتابی نہ کی جائے وہی ساری کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے۔

۲۔ اپنی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے اور ان کے احکام کے خلاف جو کچھ بھی فرد کی انفرادی زندگی یا معاشرے کی اجتماعی زندگی میں پایا جاتے اسے نکال کر زندگیوں کو خالص اطاعتِ الٰہی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔

۳۔ انسانوں کی زندگی میں جو ہستی بھی خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم اپنا اقتدار و اختیار مسلط کرنا چاہے اسے بزور اس منصب سے ہٹا دیا جائے، اور اقتدار و اختیار صرف خدا کے نیک اور مطیع فرمان بندوں کے حوالے کیا جائے۔

ہر دور میں اسلامی تحریکوں کی یہی دعوت رہی ہے جسے دعوت اسلامی کہا جاتا ہے اسی دعوت میں توانائی اور تسخیر عالم کی قوت ہے اور اسی کا سکہ رواں کرنے کے لیے انبیاء آتے رہے ہیں یہی دعوت مومن کا مقصدِ زیست ہے۔

مسلم معاشرہ اصولی طور پر دُنیا کا رہنما معاشرہ ہے۔ اسے اسلام کو جو انسانیت کی رہنمائی کے لیے خالقِ کائنات کی طرف سے آخری پیغام ہدایت ہے، عملی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کر کے اس کی رحمت و برکت کا نمونہ انسانیت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور اسلام کی سب سے بڑی تبلیغ یہی ہے کہ اس کا عملی مظاہرہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن دُنیا کی بدقسمتی اور مسلمانوں کی شومئ قسمت سے اسلام دُنیا کے سامنے ایک بار اپنی عظیم الشان داخلی قوت و برکت کا مظاہرہ کر چکنے کے باوجود اب دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور مسلمانوں کا عمل دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کے بجائے دنیا کو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو وہ سب سے پہلے بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے،

اس کے شاندار اصول اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں اور وہ ان اصولوں کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان بھی رہتی ہے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کی سکت اس کے اجتماعی عمل میں سے خارج ہو جاتی ہے یہ بے عملی اور بے حسی اس قوم کے اندر ایسے تضادات پیدا کر دیتی ہے جن تضادات سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

معاشرے کے اسی عملی تضاد کے نتیجے میں دعوائے توحید پرستی کے ساتھ بہت سی دوسری پرستشیں بھی جمع ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کے باوجود مسلمان پھر بھی فرزندِ توحید ہی رہتا ہے، اتباع رسالت کے دعوے کے ساتھ معروف کے تقاضوں کو توڑتی ہوئی بہت سی دوسری عقیدتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں لیکن عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، قرآن کے خدا کی آخری کتاب ہونے پر ایمان کے ساتھ ساتھ غیر الٰہی قوانین کی پیروی بھی بلا کراہت ہوتی رہتی ہے لیکن حقانیتِ قرآن کے دعوے میں پھر بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ دراصل انسانی اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کا عمل ہوتا ہے، ایسی معاشرتی اور اخلاقی فضا میں قول اور عمل کا تضاد انسانی سیرت و کردار کو ناقابلِ اعتماد بنا دیتا ہے، پھر کسی محبت، رفاقت، عہد و پیمان اور ربط و تعلق پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ وثوق باقی رہتا ہے کہ جو شخص آج بڑی بلند آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لیے اپنے خلوص کا دعویٰ کر رہا ہے کل وہ اس مقصد کی راہ نہیں مارے گا، یہ زوالِ کردار کی ایسی المناک صورت حال ہوتی ہے جہاں کسی مُصلح کے لیے اصلاح کا کام بہت کٹھن ہو جاتا ہے۔ قول و فعل کی مطابقت ہی ترتیب و کردار سازی کا سب سے بڑا موضوع ہے، یہ چیز اگر پیدا ہو جائے تو زندگی کے بہت سے میدان بے معرکہ فتح کیے جاسکتے ہیں۔

تضادِ فکر و عمل کی یہ ساری فضا زوال و انحطاط کے عمل سے بنتی ہے اور اس کی موجودگی میں اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرنے والے ادارے بھی اپنا اثر کھو دیتے ہیں جب انقلابی نعرے بے جان الفاظ بن جائیں اور انقلابی پروگرام روزمرہ کی رسم سے زیادہ وزن نہ رکھیں تو ایسے ہی حالات ہوتے ہیں، جب کسی معاشرے میں اسلامی دعوت کی تجدید ناگزیر ہو جاتی ہے۔

کسی نظامِ زندگی کو اپنانے کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اسے غالب کرنے کے لیے ایک تحریک اُٹھائی جائے اور وہ تحریک اس کے غلبے تک مسلسل اور پیہم حرکت میں رہے وہ اپنے دامن میں افراد کو متنوع، اعلیٰ اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ سمیٹتی رہے، ان صلاحیتوں کو مطلوبہ نظام کے غلبے کے لیے استعمال کرتی ہے، منزلِ مقصود کے کلی حصول اور اس کے بقاء و تحفّظ کے لیے انقلابی آنچ دھیمی نہ پڑنے دے، نئے افراد کا آنا کم ہو، نہ پُرانے لوگوں میں غفلت و جمود در آئے، اس لیے کہ تحریک کے لیے نو بہ نو پروگرام بنانا، اس کا آگے ہی آگے پیش قدمی کرنا، اس میں نئے آنے والوں کی مناسب تربیت کر کے انہیں اخلاقی اور علمی سطح پر تحریک کے معیار کے مطابق بنانا اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لینا انتہائی ناگزیر عمل ہے، اگر یہ کام ہو رہا ہو اور مسلسل ہوتا رہے تو تحریک نہ صرف اس نظام کے غالب آنے تک مسلسل فعال، متحرک اور جاندار ہوتی رہتی ہے بلکہ اس نظام کے غالب ہونے کے بعد بھی اس نظام کو اس کی صورت میں لانے، اس کی مخالف قوتوں کو سرنگوں کرنے اور اس نظام کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کو رفع کرنے کا اہتمام جاری رہتا ہے جس سے ایک پائیدار نظام وجود میں آتا ہے۔

ہر داعی ایک مقصد لے کر اُٹھتا ہے جو اپنے اندر گوناگوں اجتماعی تقاضے رکھتا ہے۔ داعی کا خطاب پتھروں، درختوں اور دیواروں سے نہیں ہوتا، جو سمجھ سکتے ہیں اور نہ حرکت کر سکتے ہیں بلکہ اس کا خطاب انسانوں ہی سے ہوتا ہے، خدا نے جنہیں فہم کے لیے دماغ، تاثر کے لیے قلب اور حرکت و عمل کے لیے ہاتھ پاؤں دیئے ہوتے ہیں، جن کی اس انقلابی تحریک کے ساتھ موافقت سے تعاون اور مخالفت سے مزاحمت ظہور میں آتی ہے۔

جس طرح ہر زندگی کا پوشیدہ تقاضا موت ہے اور ہر موت کا پوشیدہ تقاضا قیامت ہے، اسی طرح ہر دعوت کا پوشیدہ تقاضا تعاون و رفاقت ہوتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ تعاون کے ساتھ ہی مخالفت اور مزاحمت بھی اسے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ

جن لوگوں کو داعی مخاطب کرتا ہے وہ دعوت کا پیغام سُن کر غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، انہیں داعی کی طرف یا تو دست تعاون بڑھانا پڑتا ہے یا دست عداوت، اور یوں دعوت دورِ کشمکش میں داخل ہو جاتی ہے۔

دعوت کی حیثیت ایک ایسی مشین کی سی ہوتی ہے جو افادۂ عام کی خاطر شارع عام پر نصب کی جا رہی ہو، داعی کا کام یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اس بات پر مطمئن کرے کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اس مشین کو بر سرِ عام نصب کیا جائے، وہ اس کے فوائد گن گن کر بتائے، اس کے نصب کیے جانے کے خلاف جتنے ممکن اعتراضات ہوں ان کو رفع کرے اس جگہ سے جو پُرانی تعمیر منہدم کرنا مقصود ہو اس کے انہدام کی اشد ضرورت اور اہمیت واضح کرے اور پُرانی عمارت کی موجودگی کے نقصانات گنائے پھر ہر شخص کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کرے کہ خلق خدا کا فائدہ اسی میں ہے کہ پُرانی عمارت ہٹا کر وہاں نئی مشین نصب کر دی جائے، دعوت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی، اور خلقِ خدا تک دعوت پہنچانے کے فطری کام سے پہلو تہی کر کے کوئی تحریک انحطاط اور جمود سے نہیں بچ سکتی جمود کی اس کیفیت کو توڑنے والی قوت بھی صرف دعوت ہی ہوتی ہے جس سے تحریک کی گاڑی متحرک رہتی ہے، اس لیے دعوتِ دین ہی حقیقی قوت اور توانائی کا سرچشمہ ہے، اور داعی کا کام یہ ہوتا ہے کہ دعوت کے چشمے کو کبھی خشک نہ پڑنے دے، دعوتِ دین ہی مومن کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے اور اس نصبُ العین کی طرف پیش قدمی کرتے رہنا مومن کے ایمان کی سلامتی کی ضمانت ہے۔

دعوتِ دین

اسلام[1] محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف چیزیں لاکر جمع کر دی گئی ہوں بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اُصولوں پر رکھی گئی ہے، اس کے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اُصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے، انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی رُوح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے، ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنا، اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی رُوح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السّلام کا مشن

اسلام کے متعلق دو باتیں قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السّلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد بن عبد اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مشن ہی

---

[1] اسلامی ریاست از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص ۱۱۳ تا ۱۲۵۔

نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کا یہی مشن تھا، دوسری یہ کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء بھی دُنیا میں آئے ہیں ان کی آمد کا مقصد توحید خدائے واحد کی خدائی منوانا اور صرف اسی ایک کی عبادت کرانا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے بظاہر یہ دونوں باتیں بالکل پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں، ہر مسلمان ان کو سُن کر کہے گا کہ یہ معلوم و معروف باتیں ہیں جنہیں ایک دیہاتی مسلمان بھی جانتا ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اُٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اُتریں، سب کچھ اسی پردے کے پیچھے چُھپا ہوا ہے، تجسّس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھیے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا؟ صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ[1] کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی، جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے، کہ مسجد میں خدائے واحد کے سامنے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی غیر مشروط وفاداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لیے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا۔

آئیے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا دنیا کی دوسری طاقتوں سے اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفّار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے، ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفّار و مشرکین کا خالق بھی ہے

---

[1] ترجمہ: اس کے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں (آل اعراف)

کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَآ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ۝ (مومنون ۸۴تا۸۹)

"ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کا ہے۔ کہو، پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو، ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ، کہو، پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیے گئے ہو؟"

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ ۝ (عنکبوت: ۶۱)

"اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں"

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ (عنکبوت: ۶۳)

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری

ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی ؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ نے "۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝

(الزخرف : ۸۷)

" اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے، وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جارہے ہیں ؟ "

ان آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے اور مالکِ ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا، لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لیے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کی آمد کس لیے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا ؟

قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے، جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو اللہ اور رب نہ مانو، مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔

آیئے ذرا پھر تجسّس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے ؟ الٰہ سے کیا مراد ہے ؟ رب کسے کہتے ہیں ؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو مگر دنیا کیوں اس بات پر لڑنے کھڑی ہوجاتی تھی ؟

اِلٰہ اور رَبّ کا مفہوم

الٰہ کے معنیٰ آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف کیجیے گا معبود کے معنیٰ آپ بھول گئے ہیں، معبود کا مادہ عبد ہے، عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں، عبادت کے معنیٰ محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے، خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، جذبہ وفاداری سے سرشار ہونا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو

اسے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اسے پیش کر دینا، اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

اور "رب" کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے، چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رَبُّ المال اور صاحبِ خانہ کو ربُّ الدار کہتے ہیں، آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربّی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی اُمید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد ہو جانے کا خوف کرے جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرماں برداری اور اطاعت کرے، وہی اس کا رَبّ ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنیٰ پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھیے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے اور اُٹھ سکتا ہے، خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے، انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار یا خواہشِ انتفاع اسے اس بات پر اُبھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے، ان سے اپنی بندگی کرائے، ان کے سر اپنے آگے جھکوائے ان پر اپنا حکم چلائے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے، یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں

کرسکا ہے جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مُفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکّہ جمادے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

راست دعویدار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لیے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کردیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا، اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی اللہ ہے) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں، لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کردوں گا) اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بحث ہوئی تھی، قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھیے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ط قَالَ اِبْرٰھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ

مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ط
(بقرہ : ۲۵۸)

"تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم (علیہ السّلام) سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لیے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں میری زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے، ابراہیمؑ نے کہا، اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے، تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا، یہ سن کر وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔"

غور کیجیے! وہ کافر ہکّا بکّا کیوں رہ گیا؟ اس لیے کہ وہ اللہ کے وجود کا منکر نہ تھا، وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ کائنات کا فرماں روا اللہ ہی ہے، سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے، جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے، بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً سرزمین عراق کے باشندوں کا مالک کون ہے، وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ سلطنتِ عراق کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرّف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جس کی چاہے جان بخشی کر دے یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تم مجھے رب تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو، مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں اس کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لیے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں۔

یہ خدائی جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک

محدود نہ تھی، دُنیا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے، ایران میں بادشاہ کے لیے خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسمِ عبودیت بجالائے جاتے تھے، حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدائیگان (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدّعی تھے، اسی طرح ہندوستان میں فرماں روا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ـــــــ چنانچہ سُورج بنسی اور چندر بنسی آج تک مشہور ہیں ـــــــ راجہ کو اَن داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور اور پرماتما ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی، ایسا ہی حال دُنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے بعض جگہ فرماں رواؤں کے لیے اِلٰہ اور رب کے ہم معنیٰ الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے، اس نوع کے دعوائے خداوندی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں الٰہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اس فرماں روائی و حکمرانی، اس کی آقائی و خداوندی کو قائم کرتے ہیں جسے فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا، دراصل الٰہ اور رب کے معنیٰ و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں اور وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہرحال ان کے الٰہ و رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں چاہے زبان سے الفاظ نہ کہیں۔

بالواسطہ دعویدار

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی اُلٰہیت اور ربُوبیّت کا دعویٰ کرتی ہے، دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ ایسا دعویٰ لے کر اُٹھیں اور اسے منوالیں، البتّہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں، جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر

جادو کر سکتے ہیں، سو ان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی رُوح، کسی دیوتا، کسی بُت، کسی قبر کسی سیارے یا کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ و مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں، ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں، لہٰذا ہماری بزرگی تسلیم کرو ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان و مال، آبرو سب کچھ دے دو۔ بہت سے بے وقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے، اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی، کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکامات دینا شروع کر دیتے ہیں، یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں، یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف طریقوں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دُنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکّہ جما رکھا ہے۔

فتنہ کی اصل جڑ

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دُنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بِس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تو خیر فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے، مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو اِلٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گویا اس کی زندگی محال ہے، اگر کوئی الٰہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے الٰہ اور ربّ سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے اِلٰہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلّط ہو جائیں گے، آج بھی آپ جدھر نگاہ ڈالیں گے یہی نظر آئے گا، کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے، کہیں ایک پارٹی نے الٰہیّت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے، کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِیْ کی منادی کر رہا ہے، انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے، اوّل تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیّت و ربوبیّت قائم ہوئی وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی، انسانی رُوح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر

ہی رہی، انسانوں کے دل و دماغ پر اُس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں، جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقا کو روک دیا، کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:۔

قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اِنِّیْ خَلَقْتُ عِبَادِیْ حُنَفَاءَ فَجَاءَتْھُمُ الشَّیٰطِیْنُ فَاجْتَالَتْھُمْ مِنْ دِیْنِھِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَیْھِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَھُمْ (حدیث قدسی)

"اللہ عزّ وجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، انہیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کرکے رکھ دیا۔"

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے، یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے، یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے، قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کرکے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف ربُّ العالمین کو اپنا ربّ قرار دے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لیے نہیں ہے کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

انبیاء کا حقیقی اصلاحی کام

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی، وہ دراصل انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لیے یہ لوگ آتے، ان کا اصلی مشن

یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور بیجا انتفاع سے نجات دلائیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں جو اس حد سے نیچے گرا دیے گئے ہیں انہیں اُبھار کر اس حد تک اُٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں، ابتدا سے جتنے نبی دُنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا:

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا اللہ نہیں ہے۔"

یہی حضرت نوحؑ نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے کہا اور یہی اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے:

إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا۔ (ص: ۶۵، ۶۶)

"میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے اور آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔"

إِنَّ رَبَّكُمُ اللهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِأَمْرِهٖ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ۔ (الاعراف: ۵۴)

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اُسی کا امر ہے۔"

ذٰلِكُمُ اللهُ رَبُّكُمْ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ

كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○

(الانعام: ۱۰۲)

"وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ۔

(البینہ: ۵)

"لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے یک سو ہو کر۔"

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (آل عمران: ۶۴)

"آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں، اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔"

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی مادّی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا:

"یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے ہوتے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔"

(الاعراف: ۱۵۷، ۱۵۸)

غرض اگر ہم اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ہم خدا پر ایمان لائیں۔ اس کی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرمان بردار رعیت

کی طرح سپرد کردیں اور اس یقین کے ساتھ دُنیا میں زندگی بسر کریں کہ ہمارے چُھپے اور کھُلے سب کاموں کو جانتا ہے اور ایک دن ہمیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ اس تصورِ زندگی میں انسان کی فلاح مضمر ہے۔

یہی وہ دینِ حق ہے جس کی دعوت دینے اور تبلیغ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دیا ہے۔ (اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصوّرات ص ۱۰۰، ۱۰۱)

دعوتِ دین کی اہمیّت

دعوتِ دین اللہ کا اپنا کام ہے، اس کام کا کرنے والا اللہ کا مددگار ہوتا ہے فرمایا:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (آل عمران : ۵۲)

"جب عیسیٰ علیہ السّلام نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو انہوں نے کہا "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے"؟ حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں! ہم اللہ پر ایمان لائے گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر جُھکا دینے والے) ہیں۔"[۱]

حق کی رفاقت

دین اسلام کی اقامت میں حصّہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "اللہ کی مدد کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ ایک اہم مضمون ہے، زندگی کے جس دائرے میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے۔ اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی

---

[۱] تفہیم القرآن۔ آل عمران ۵۲۔

طاقت سے مجبور نہیں کرتا، اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق بات اور فلاح و نجات کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں، ان کو اللہ تعالیٰ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے اور یہ مقام بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے، نماز روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہی ہوتا ہے مگر تبلیغ دین اور اقامت دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

حق کی حفاظت

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج[1] : ۴۰)

"اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔"

یہ حکم مظلوم اہلِ حق کو قتال فی سبیل اللہ کی اجازت دینے کے بعد اور اس بات کی حکمت بیان کرنے کے بعد کہ یہ قتال فی سبیل اللہ کیوں ضروری ہے، دیا گیا ہے، اس لیے کہ اگر ظالموں اور جابروں کو یونہی مہلت ملتی رہے تو زمین شر و فساد سے بھر جائے اور دُنیا میں اللہ کے نام لینے کی جگہیں تک سلامت نہ رہیں۔ لہٰذا جو لوگ خلقِ خدا کو توحید کی طرف بُلاتے ہیں اور شر کی جگہ خیر کو فروغ دینے کی سعی و جہد کرتے ہیں وہ دراصل اللہ کے مددگار ہیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا کام ہے جسے انجام دینے میں وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

---

[1] الحج ۴۰۔ تفہیم القرآن۔

آزمائش حق

اللہ کے مددگار بننے میں اس کے معیار اور مقام کو پرکھنا بھی مطلوب ہوتا ہے

ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا
بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ (محمد[1] : ۴)

"یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ آزماتے۔"

کرنے کے کام سے مراد وہ طریقے ہیں جو جہاد میں مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، اس میں مومنین کی آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر محض باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی ہوتی تو وہ تمہارے کام کا محتاج نہ تھا، یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان بھی چشمِ زدن میں کر سکتا تھا مگر اس کے پیشِ نظر تو یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو حق پرست ہوں وہ باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے مقابلہ میں مجاہدہ کریں تاکہ جس کے اندر جو کچھ اوصاف ہیں وہ اس امتحان سے نکھر کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے کردار کے لحاظ سے جس مقام اور مرتبہ کا مستحق ہو وہ اس کو دیا جائے۔

بندہ اور اللہ کی مدد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ
اَقْدَامَكُمْ ۝ (محمد[2] : ۷)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد

---

[1] تفہیم القرآن۔ سورہ محمد ۵

[2] تفہیم القرآن۔ سورہ محمد۔ ۷

کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔"

اللہ کی مدد کرنے کا ایک سیدھا سادہ مفہوم تو یہ ہے کہ اس کا حکم بلند کرنے کے لیے جان و مال سے جہاد کیا جائے لیکن اس کا پوشیدہ مفہوم بھی ہے جس کی تشریح سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پکار مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ میں ہو چکی ہے یعنی افہام و تفہیم سے لوگوں کو کفر و بغاوت اور سرکشی سے اطاعت و فرماں برداری پہ قائل کرنا، یہ دعوت و تبلیغ کا کام جب آدمی کرنے لگتا ہے تو اللہ اسے یونہی نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ خستہ حال اور پریشان حال ہو کر رہے، بلکہ اللہ اس کی نصرت فرماتا ہے، اور اس کے لیے ایسے اسباب مہیا کرتا ہے کہ اس کے قدم خوب جم جاتے ہیں اور مخالف اسے کمزور نہیں پاتا۔ مزید فرمایا:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید : ۲۵)

"یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے، یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔"

یعنی اللہ کو اس مدد کی ضرورت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے اور اپنی طاقت سے یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ یہ طریق کار اس نے انسانوں کی آزمائش کے لیے اختیار فرمایا ہے، اور اسی آزمائش سے گزر کر انسان اپنی ترقی اور فلاح کی راہ پر آگے بڑھ سکتا ہے اللہ تو ہر وقت یہ قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے اپنے ایک اشارے سے تمام کافروں کو مغلوب کر دے اور اپنے رسولوں کو ان پر غلبہ و تسلط عطا فرما دے مگر پھر رسولوں پر ایمان لانے والوں کا کیا کمال ہوگا، جس کی بنیاد پر وہ کسی انعام کے مستحق ہوں ؟ اسی لیے اللہ نے اس کام کو اپنی غالب قدرت سے انجام دینے

لہ تفہیم القرآن۔ الحدید۔ ۲۵

کے بجائے طریق کار یہ اختیار فرمایا کہ اپنے رسولوں کو بینات اور کتاب اور میزان دے کر انسانوں کے درمیان مبعوث کر دیا، ان کو اس بات پر مامور فرما دیا کہ لوگوں کے سامنے عدل کا راستہ پیش کریں اور ظلم وجور اور بے انصافی سے باز آجانے کی ان کو دعوت دیں۔ انسانوں کو اس امر کا پورا اختیار دے دیا کہ ان میں سے جو چاہے رسولوں کی دعوت کو قبول کرے اور جو چاہے اسے رد کر دے، قبول کرنے والوں کو پکارا کہ آؤ، اس عدل کے نظام کو قائم کرنے میں میرا اور میرے رسولوں کا ساتھ دو اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جان توڑ جدّ وجہد کرو جو ظلم وجور کے نظام کو باقی رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو انصاف کی بات کرتا ہے اور کون لوگ ہیں جو انصاف کے مقابلے میں بے انصافی قائم رکھنے کے لیے اپنی جان فی سبیل الطاغوت لڑاتے ہیں اور کون ہیں جو انصاف کی بات قبول کر لینے کے بعد اس بات کی حمایت اور اس کی خاطر جدّ وجہد کرنے سے جی چراتے ہیں، اور کون ہیں جو اَن دیکھے خدا کی خاطر دُنیا میں اس حق کو غالب کرنے کے لیے جان ومال کی بازی لگا دیتے ہیں، اس امتحان سے جو لوگ کامیاب ہو کر نکلیں گے انہیں کے لیے آئندہ ترقیوں کے دروازے کھُلیں گے۔

اَلَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اَمۡوَالِهِمۡ یَبۡتَغُوۡنَ
فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانًا وَّ یَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۝ (الحشر : ۸)

”جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں، یہی راست باز لوگ ہیں۔“[1]

---

[1] تفہیم القرآن۔ سورہ الحشر۔ ۸۔

ترقیِ درجات

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ
مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ
طَّآئِفَۃٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا
ظٰھِرِیْنَ ۝ (الصف[1]: ۱۴)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی راہ میں میرا مددگار؟ اور حواریوں نے جواب دیا تھا "ہم ہیں اللہ کے مددگار" اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے۔"

یہ آخری مقام ہے جہاں قرآن مجید میں ان لوگوں کو اللہ کا مددگار کہا گیا ہے جو خلقِ خدا کو دین کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کے دین کو کفر کے مقابلے میں غالب کرنے کی جدّوجہد کرتے ہیں۔ اس سے پہلے سورۂ آل عمران آیت ۵۲۔ سورہ حج آیت ۴۰۔ سورہ محمد آیت ۷۔ سورہ حدید آیت ۲۵۔ اور سورہ حشر آیت ۸ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ اُلجھن پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تمام خلق سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں تو کوئی بندہ آخر اللہ کا مددگار کیسے ہو سکتا ہے اس اُلجھن کو رفع کرنے کے لیے ہم یہاں اس

---

[1] تفہیم القرآن۔ الصف ۱۴

مسئلے کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں۔

دراصل ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار اس لیے نہیں کہا گیا کہ اللہ ربّ العالمین معاذاللہ کسی کام کے لیے اپنی کسی مخلوق کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو کفر و ایمان اور اطاعت و معصیت کی آزادی بخشی ہے اس میں وہ لوگوں کو اپنی قوت قاہرہ سے کام لے کر بجبر مومن و مطیع نہیں بناتا بلکہ اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے ان کو راہ راست دکھانے کے لیے تذکیر و تعلیم اور تفہیم و تلقین کا طریقہ اختیار فرماتا ہے، اس تذکیر و تعلیم کو جو شخص برضا و رغبت قبول کرے وہ مومن[1] ہے، جو عملاً مطیع فرمان بن جائے، وہ مسلم[2] و قانت اور عابد ہے جو خدا ترسی کا رویہ اختیار کرے وہ متقی[3] ہے، جو نیکیوں کی طرف سبقت کرنے لگے وہ محسن[4] ہے، اور اس سے مزید ایک قدم آگے بڑھ کر جو اسی تذکیر و تعلیم کے ذریعہ سے بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے اور کفر و فسق کی جگہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کرنے کے لیے کام کرنے لگے اسے اللہ تعالیٰ خود اپنا مددگار[5] قرار دیتا ہے جیساکہ آیاتِ مذکورہ بالا میں کئی جگہ بالفاظ صحیح ارشاد ہوا ہے، اگر اصل مقصود اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کے دین کا مددگار ہوتا تو انصار اللہ کے بجائے اَنْصَارَ دِیْنِ اللّٰہِ فرمایا جاتا یَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ کے بجائے یَنْصُرُوْنَ دِیْنَ اللّٰہِ فرمایا جاتا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ کے بجائے اِنْ تَنْصُرُوْا دِیْنَ اللّٰہِ فرمایا جاتا، جب ایک مضمون کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ پے در پے کئی مقامات پر ایک ہی طرز بیان اختیار فرماتا ہے، تو یہ اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ اصل مقصود ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار ہی کہنا ہے، مگر یہ "مددگاری" نعوذ باللہ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں جس کے لیے وہ ان کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ لوگ اسی کام میں حصّہ لیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنی قوت کے ذریعہ سے کرنے کے بجائے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتا ہے۔

دعوتِ حق اور اس کا مقصد

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝

(عبس : ۳، ۴)

"تمہیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔"

یعنی دعوتِ حق کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ بگڑے ہوئے اور خدا کی بندگی اور اطاعت سے منحرف لوگوں کی اصلاح اور سُدھار ہو تاکہ وہ ربُّ العالمین کی بندگی قبول کر کے شر و فساد سے اجتناب کریں اور گندے اخلاق کو ترک کر کے پاکیزہ اخلاق اختیار کریں۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝

(النّٰزعات : ۱۷، ۱۸، ۱۹)

"فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو۔"

فرعون کی جس سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے متجاوز کر کے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے، خالق کے مقابلے میں اس کی سرکشی کا ذکر تو آگے اسی سورہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ :

فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى

"اس نے اپنی رعایا کو جمع کر کے اعلان کیا کہ" میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔"

اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں

کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کمزور طبقوں پر سخت ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور پوری اپنی قوم کو بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا جیسا کہ سورہ قصص ۴ امیں ان الفاظ میں مذکور ہے :

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (القصص: ۴)

"واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی عورتوں کو جیتا رہنے دیتا تھا فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"[1]

اور سورۂ زخرف میں ہے :

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ (زخرف : ۵۴)

"اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔"

فرعون کی اس سرکشی میں مبتلا ہونے اور اس سرکشی سے اسے نکالنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ تزکیہ کے ہیں کہ وہ اس سرکشی سے باز آجائے۔ جو اس نے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں اختیار کر رکھی تھی اور اس کا ذریعہ خوفِ خدا ہے تو دونوں کا ذکر فرمایا کہ میں تمہیں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں اس کی عظمت اور جبروتیت تیرے سامنے پیش کروں تاکہ تیرے دل میں اس کا خوف اور اپنی بندگی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہو تو خلق اور خالق دونوں کے مقابلے میں سرکشی سے باز آجائے۔

---

[1] تفہیم القرآن۔ سورہ القصص۔ ۴

تزکیہ، معنی و مفہوم

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ۝ (الاعلیٰ : ۱۴)

"فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی"

پاکیزگی سے مراد کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، بُرے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور بُرے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال اختیار کرنا۔ فلاح سے مراد دُنیوی خوشحالی نہیں بلکہ حقیقی کامیابی ہے خواہ دُنیا کی خوشحالی اس کے ساتھ میسّر ہو یا نہ ہو۔

دعوتِ حق ایک نصیحت

کَلَّآ اِنَّہٗ تَذۡکِرَۃٌ ۝ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ۝

(عبس : ۱۱، ۱۲)

"ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کر لے"

یعنی دعوتِ حق کو رد کرنے والوں کی بے جا خواہشیں اور مطالبے پورے نہیں کیے جا سکتے، مثلاً یہ کہنا کہ اگر واقعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکّہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو، اور یہ خط ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفارِ مکّہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے"

ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر

---

۱ ؎ تفہیم القرآن۔ الاعلیٰ ۱۱، ۱۲۔ ۲ ؎ تفہیم القرآن۔

چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لاکر ہمیں دیں، جسے ہم پڑھیں (بنی اسرائیل ۹۳)
کیونکہ یہ تو سراسر نصیحت ہے جس کا جی چاہے اس نصیحت اور سبق کو حاصل کرے۔

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيلًا ۝

(الدھر[1]: ۲۹)

"یہ ایک نصیحت ہے اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے"

نصیحت (ذکر) قبول کرنے والے کون لوگ ہیں اور نہ قبول کرنے والے کون۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝

(الاعلیٰ[2]: ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳)

"جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرلے گا، اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت ہے جو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا"

یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجامِ بد کا اندیشہ ہوگا اسی کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں جارہا ہوں، اور وہی اللہ کے اس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سُنے گا، جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق اور فلاح و سعادت کا راستہ بتارہا ہو۔

اَلْاَشْقٰی یعنی جو مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریت پر قائم رہا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول نہ کیا تو اس کی سزا یہ ہوگی کہ جہنم میں ڈالا جائے گا، تو نہ اسے موت آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے اور نہ جینے کی طرح جیے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔

---

[1] تفہیم القرآن۔ الدھر ۲۹۔ [2] تفہیم القرآن۔ الاعلیٰ ۱۰ تا ۱۳۔

راہِ حق کا مسافر

اَفَمَنۡ يَّمۡشِىۡ مُكِبًّا عَلٰى وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰٓى اَمَّنۡ يَّمۡشِىۡ
سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ (الملک : ۲۲)

"بھلا جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے
یا وہ جو سر اٹھائے، سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟"

جس پر مزید ان الفاظ میں اضافہ کیا گیا ہے:

قُلۡ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ
وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـئِدَةَ ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۝

"ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا تم کو سننے اور دیکھنے کی
طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"

یعنی اللہ نے تو تمہیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا، تمہارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ یہ کان تمہیں اس لیے تو نہیں دیے گئے تھے کہ جو شخص تمہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات سن کر توجہ نہ دو اور جو خلط ملط باتیں پہلے سے تمہارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں انہی پر اڑے رہو، یہ آنکھیں تمہیں اس لیے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بینائی سے کام لے کر یہ نہ دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ آیا اس کی توحید کی شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظام کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اس کو چلا رہے ہیں، اس طرح دل و دماغ بھی تمہیں اس لیے نہیں دیے گئے تھے کہ تم سوچنے

له تفہیم القرآن۔ سورہ الملک ۲۲، ۲۳

سمجھنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کرو کہ وہ غلط ہے یا صحیح ، اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں حق شناسی کے لیے دی تھیں. تم ناشکری کر رہے ہو کہ ان سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لیے یہ دی گئی تھیں۔

حق کے منکر

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی (الملک[1]: ۲۲)

"غور کرو جو منہ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے؟"

یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کیے ہوتے اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اسے ڈال دیا ہو:

فَمَا لَھُمْ عَنِ التَّذْکِرَۃِ مُعْرِضِیْنَ ۙ کَاَنَّھُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ ۙ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَۃٍ ؕ (المدثر[2]: ۴۹، ۵۰، ۵۱)

"آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔"

یہ ایک عربی محاورہ ہے جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا، اس لیے اہل عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے کو جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے۔

حق کی نصیحت

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۔ (العصر[3]: ۳)

"اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے۔"

---

[1] تفہیم القرآن۔ الملک ۲۲۔ [2] تفہیم القرآن۔ المدثر ۴۹ تا ۵۱۔ [3] تفہیم القرآن۔ العصر۔ ۳

اس آیت کریمہ میں اجتماعی خسارے اور معاشرے کو بگاڑ سے بچانے کی تدبیر بیان فرمائی ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو جس طرح خود نیک اور صالح بننے کی کوشش کرنی چاہیے اسی طرح ضروری ہے کہ ان کے اجتماع سے بھی ایک مومن اور صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے، دوسرے اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے اس لیے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور یہ بالعموم دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ اور ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دُنیا کے معاملات سے، دوسرے وہ حق جس کا ذکر کرنا انسان پر واجب ہو خواہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق، پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو، اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشہ دیکھتے رہیں بلکہ اس معاشرے میں یہ رُوح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اُٹھائے کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرزِ عمل کی نصیحت کرے، یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے، اگر یہ رُوح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں، مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں، یہی بات ہے جو سورۃ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا، اور لوگوں نے

ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸ - ۷۹) پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا ہفتے کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے، (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶) اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵) اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُمّت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران - ۱۰۴) اور اس اُمّت کو بہترین اُمّت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے۔ (آل عمران : ۱۱۰)

دعوتِ حق کی کامیابی

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (الاعراف: ۱۰۳)

”پھر ان (قوموں) کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔“

اوپر جو قصّے بیان ہوئے ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے، اسے پھر ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا اس کے بعد اب موسیٰ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور سبق بھی کفار قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیے گئے ہیں۔

کفّار قریش کو اس قصّے کے پیرائے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ

دعوت کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے، اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ حق کی تو پوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دُنیا کی اقلیت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی سروسامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے پھر بھی آخر کار وہی غالب آکر رہتا ہے، نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعیِ حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کتنی کتنی طویل مدت سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے اور جب کسی تنبیہ، کسی سبق آموز واقعہ اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انہیں عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصے میں دوہرا سبق دیا گیا ہے، پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری کو نا واقفانِ حق کی کثرت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ ٹوٹے اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں کی طرح خدا کی لعنت میں بھی گرفتار ہوتا ہے۔

قصۂ یوسف علیہ السلام سے جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت رکھتا ہو اور حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو تو محض اپنے اخلاق کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے، یوسف علیہ السلام کو دیکھیے ۱۷ برس کی عمر، تن تنہا، بے سروسامان، اجنبی ملک اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں، تاریخ کے اس دور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا جس کی معیادِ سزا بھی کوئی نہ تھی، اس حالت تک گرا دیے جانے کے بعد وہ محض اپنے ایمان اور اخلاق

کے بل پر اُٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو مسخر کر لیتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (یوسف: ۵۶)[1]

"اس طرح ہم نے اس زمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی، وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے، ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا۔"

یعنی اب ساری زمین مصر اس کی تھی، اس کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کہہ سکتا تھا، وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جو اس سے روکا جا سکتا تھا، یہ گویا اس کامل تسلط اور ہمہ گیر اقتدار کا بیان ہے جو حضرت یوسف علیہ السّلام کو اس ملک پر حاصل تھا، قدیم مفسرین بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں، چنانچہ ابن زید کے حوالے سے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ "ہم نے یوسف کو ان سب چیزوں کا مالک بنا دیا جو مصر میں تھیں، دُنیا کے اس حصہ میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا۔ وہ سرزمین اس کے حوالے کر دی گئی تھی، حتّٰی کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو اپنا زیر دست کرے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا۔" دوسرا قول علامہ موصوف نے مجاہد کا نقل کیا ہے جو مشہور ائمۂ تفسیر میں سے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بادشاہ مصر نے یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

دعوتِ حق اور اللہ کی رفاقت

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد ۴۰)[2]

"بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔"

---

[1] تفہیم القرآن۔ یوسف ۵۶ [2] تفہیم القرآن۔ الرعد ۴۰۔

مطلب یہ کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوت کو جھٹلا دیا ہے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب وہ ظہور میں آتا ہے؟ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے، اسے پوری یکسوئی کے ساتھ کیے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے ہے، مگر دراصل بات ان مخالفین کو سُنانی مقصود ہے جو چیلنج کے انداز میں بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہتے تھے کہ ہماری جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ کیوں نہیں آتی:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ
اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ
وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (الرعد: ۴۱، ۴۲)

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں۔ اللہ حکومت کر رہا ہے کوئی اس کے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں مگر اصل فیصلہ کُن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جانتا ہے کہ کون کچھ کمائی کر رہا ہے اور عنقریب یہ منکرینِ حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے؟"

یہ ارشاد کہ ہم اس کا دائرہ تنگ کرتے چلے آتے ہیں، بہت واضح ہے۔ یعنی کیا تمہارے مخالفین کو نظر نہیں آرہا ہے کہ اسلام کا اثر سرزمین عرب کے گوشے گوشے میں پھیلتا جارہا ہے اور چاروں طرف سے ان پر حلقہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے؟ یہ ان کی شامت کے آثار نہیں ہیں تو کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں" ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے، چونکہ دعوتِ حق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور

اللہ اس کے پیش کرنے والوں میں سے ہوتا ہے، اس لیے کسی سرزمین میں اس دعوت کے پھیلنے کو اللہ تعالیٰ یوں تعبیر فرماتا ہے کہ ہم خود اس سرزمین میں بڑھے چلے آرہے ہیں۔

"دعوت حق کے مقابلے میں مخالفین کی چالیں ناکام ہوں گی"

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا (الرعد: ۴۲)

ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں، مگر اصل فیصلہ کُن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یعنی آج کوئی نئی بات نہیں کہ حق کی آواز کو دبانے کے لیے جھوٹ اور فریب اور ظلم کے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہوں، پچھلی تاریخ میں بارہا ایسی چالوں سے دعوتِ حق کو شکست دینے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ (النحل: ۱۰)

"آگیا اللہ کا فیصلہ اب اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ"

یعنی بس وہ آیا ہی چاہتا ہے اس کے ظہور اور نفاذ کا وقت قریب آلگا ہے۔ اس بات کا صیغہ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے کے لیے فرمایا گیا یا پھر اس لیے کہ کفار قریش کی سرکشی اور بدعملی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، اور آخری فیصلہ کُن قدم اُٹھائے جانے کا وقت آگیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فیصلہ" کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب) کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے، جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا، قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے ان کے کفر و انکار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ حکم ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے، اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کُن عذاب آجاتا ہے یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے، یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے، ہجرت جب

واقع ہوئی تو کفارِ مکہ سمجھے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہے، مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکے سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (المجادلہ : ۵)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہو چکے ہیں۔ ہم نے صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔"

اصل میں لفظ کُبِتَ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ ہیں رُسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، راندۂ درگاہ کر دینا، دھکے دے کر نکال دینا، تذلیل کرنا۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت اور اُس کے احکام سے بغاوت کا جو انجام پچھلے انبیاء کی جو اُمتیں دیکھ چکی ہیں، اس سے وہ لوگ ہرگز نہ بچ سکیں گے جو اب مسلمانوں میں سے وہی روش اختیار کریں گے۔ انہوں نے بھی خدا کی شریعت کے خلاف خود قوانین بنائے، یا دوسروں کے بنائے ہوتے قوانین کو اختیار کیا تب اللہ کے فضل اور اس کی نظرِ عنایت سے وہ محروم ہوتے اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی زندگی ایسی گمراہیوں، بدکرداریوں اور اخلاقی و تمدنی بُرائیوں سے لبریز ہوتی چلی گئی جنہوں نے بالآخر دنیا ہی میں ان کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑا۔ یہی غلطی اگر اب اُمتِ محمدیہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مقبولِ بارگاہ ہی رہے اور اللہ اسے ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچائے چلا جائے۔ اللہ کو نہ اپنے پچھلے رسولوں کی اُمت سے کوئی عداوت تھی، نہ اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت سے اس کا کوئی خصوصی رشتہ ہے۔

اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے، سیاق و سباق کی عبارت پر غور

کرنے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہاں اس روش کی دو سزاؤں کا ذکر ہے، ایک کبت، یعنی وہ خواری و رسوائی جو اس دُنیا میں ہوئی اور ہوگی دوسرے عذابِ مہین، یعنی ذلت کا وہ عذاب جو آخرت میں ہونے والا ہے۔

آخری کامیابی مومنین کا حق

وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد: ۴۲)

"اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے"

اس کا ظہور جاہلی سوسائٹی میں کس طرح کھلبلی ڈالتا ہے:

قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ○ (ہود: ۶۲)

"انہوں نے کہا کہ اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بُلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"

اس آیت کریمہ سے تین باتیں یا یوں کہیے کہ تین مضامین پر روشنی پڑتی ہے پہلی بات یہ کہ نبی کے متعلق بعثت سے قبل لوگوں کے تصورات اس کی شخصیت کے بارے میں کس طرح کے ہوتے ہیں قوم صالح حضرت صالح کے بارے میں بعثت کے بعد کس طرح حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا، جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔

۱؎ تفہیم القرآن۔ الرعد ۴۲ ۲؎ تفہیم القرآن۔ ہود ۶۲

یعنی ہوشمندی، ذکاوت، فراست، سنجیدگی و متانت اور پُروقار شخصیت کو دیکھ کر ہم یہ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ بڑے آدمی ہو گے۔ اپنی دنیا بھی خوب بناؤ گے اور ہمیں بھی دوسری قوموں اور رقیبوں کے مقابلے میں تمہارے تدبّر سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ مگر تم نے یہ توحید اور آخرت کا نیا راگ چھیڑ کر تو ہماری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یاد رہے کہ ایسے ہی کچھ خیالات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ کی ہم قوموں میں پائے جاتے تھے، وہ بھی نبوت سے پہلے آپ کی بہترین قابلیتوں کے معترف تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص بہت بڑا تاجر بنے گا اور اس کی بیدار مغزی سے ہم کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچے گا، مگر جب ان کی توقعات کے خلاف آپ نے توحید و آخرت اور احکامِ اخلاق کی دعوت دینی شروع کی تو وہ آپ سے نہ صرف مایوس بلکہ بیزار ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا خاصا کام کا آدمی تھا، خدا جانے اسے کیا جنون لاحق ہو گیا ہے کہ اپنی زندگی بھی برباد کی اور ہماری اُمیدوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔

دوسرا مضمون جس پر آیت مذکور میں روشنی پڑتی ہے، وہ ہے اسلام اور جاہلیت میں وجہ نزاع، اور دونوں کے طرزِ استدلال کا نمایاں فرق۔ ان کا قول ہے کہ:

أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔

"کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔"

یہ گویا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ معبود کیوں عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پوجا کس لیے ہوتی ہے۔ یہاں اسلام و جاہلیت کے طرزِ استدلال کا فرق نمایاں نظر آتا ہے حضرت صالح علیہ السلام نے کہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے اور اس پر دلیل یہ دی تھی کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور زمین میں آباد کیا ہے۔ اس کے جواب میں ان کی مشرک قوم کہتی ہے کہ ہمارے یہ معبود بھی مستحق عبادت ہیں اور ان کی عبادت ترک نہیں کی جا سکتی، کیونکہ باپ دادا کے وقتوں سے ان کی عبادت ہوتی

چلی آرہی ہے یعنی مکھی پر مکھی صرف اس لیے ماری جاتی رہنی چاہیے کہ ابتدا میں کسی بے وقوف نے اس جگہ مکھی ماری تھی اور اب اس مقام پر مکھی مارتے رہنے کے لیے اس کے سوا کسی معقول وجہ کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں مدتوں سے مکھی ماری جارہی ہے۔

تیسرا مضمون وہ خلجان اور اضطراب ہے جو دعوتِ حق کے ظہور کے وقت عام جاہلانہ سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار آیتِ مذکور میں ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝ (تفہیم القرآن)

"تو جس طریقے کی طرف ہمیں بُلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"

یہ شبہ اور یہ خلجان کس امر میں تھا؟ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خلجان میں تو سب پڑ گئے تھے مگر ہر ایک کا خلجان الگ نوعیت کا تھا۔ یہ دعوت حق کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ اُٹھتی ہے تو لوگوں کا اطمینان قلب رخصت ہو جاتا ہے اور ایک عام بے کلی پیدا ہو جاتی ہے، اگرچہ ہر ایک کے احساسات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر اس بے کلی میں سے سب کو کچھ نہ کچھ حصہ مل کر ضرور رہتا ہے۔ اس سے پہلے جس اطمینان کے ساتھ لوگ اپنی ضلالتوں میں منہمک رہتے تھے اور کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، وہ اطمینان اس دعوت کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ نظام جاہلیت کی کمزوریوں پر داعی حق کی بے رحم تنقید، اثباتِ حق کے لیے اس کے پُرزور اور دل لگتے دلائل، پھر اس کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا علم، اس کی شرافت نفس، اس کا نہایت کھرا اور راست بازانہ رویہ اور اس کی وہ زبردست حکیمانہ شان جس کا سکّہ بڑے سے بڑے ہٹ دھرم مخالف کے دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے، پھر وقت کی سوسائٹی میں سے بہترین عناصر کا اس سے متاثر ہوتے چلے جانا اور ان کی زندگیوں میں دعوتِ حق کی تاثیر سے غیر معمولی انقلاب رونما ہونا یہ ساری چیزیں مل جُل کر ان سب لوگوں کے دلوں کو بے چین کر ڈالتی ہیں جو

حق آجانے کے بعد بھی پُرانی جاہلیت کا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں:

اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (ابراہیم: ۹)

"کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں قومِ نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی نشانیاں لیے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ختم کرنے کے بعد اہلِ مکّہ کو براہِ راست خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق پر تمہارا غصّہ، حیرت اور انکار کوئی نئی بات نہیں، تم سے پہلے جس قدر قومیں گزری ہیں ان سب کی حالت یہ تھی کہ:

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (تفہیم القرآن)

"ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے۔"

یہ وہ حالت ہے کہ جو غصّے، انکار، جھنجھلاہٹ اور اچنبھے سے انہوں نے کی تھی، اور کہا:

لہ تفہیم القرآن۔ سورہ ابراہیم۔ ۹

إِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ وَإِنَّا لَفِى شَكٍّ مِّمَّا
تَدْعُونَنَآ إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝

"جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"

یعنی ایسا شک جس کی وجہ سے اطمینان رخصت ہو گیا ہے، یہ دعوتِ حق کا خاصا ہے کہ جب وہ اُٹھتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کھلبلی ضرور مچ جاتی ہے اور انکار و مخالفت کرنے والے بھی پورے اطمینان کے ساتھ اس کا انکار کر سکتے ہیں اور نہ اس کی مخالفت۔ دعوت کی سچائی، اس کی معقول دلیلیں، اس کی کھری کھری اور بے لاگ باتیں، اس کی دل موہ لینے والی زبان، اس کے داعی کی بے داغ سیرت، اس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں کا صریح انقلاب اور اپنی دعوتِ حق کے عین مطابق ان کے پاکیزہ اعمال، یہ ساری چیزیں مل جل کر کٹر سے کٹر مخالف کے دل میں بھی ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ داعیانِ حق کو بے چین کرنے والا خود بھی چین سے محروم ہو جاتا ہے۔

دعوتِ حق کے نازک مراحل

دعوتِ حق کے ان نازک مراحل کا تذکرہ کرنے سے پہلے جو سورہ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ایمان لانے والے چند نوجوانوں کی دعا کے پیرایہ میں بیان ہوا ہے ان حالات پر بھی نگاہ ڈال لی جائے جو اسی دُعا سے بالکل مماثل قرآن مجید نے بنی اسرائیل اور قوم فرعون کی مختصر انداز میں حالت بیان فرمائی ہے:

فَمَآ ءَامَنَ لِمُوسَىٰٓ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِۦ عَلَىٰ خَوْفٍ
مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَإِي۟هِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ۚ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ
لَعَالٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَإِنَّهُۥ لَمِنَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ (یونس: ۸۳)

"پھر دیکھو کہ موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں"

اس آیت میں اتنا بیان ہے کہ چند نوجوان مسلمان ہوتے، سن رسیدہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ لفظ "ذریۃ" کا استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ اولاد کے ہیں۔ ہم نے ترجمہ "نوجوان" کیا ہے مگر اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرتا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی، مگر ماؤں، باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی، ان پر مصلحت پرستی اور دُنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات میں نظر آرہا تھا، بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے عذاب میں مبتلا ہوگے اور ہم پر بھی عذاب لاؤ گے"

یہ بات خاص طور پر قرآن نے نمایاں کرکے اس لیے پیش کی ہے کہ مکّہ کی آبادی میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے، بلکہ چند باہمت نوجوان تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقتِ اسلامی کی حمایت کررہے تھے اور ظلم وستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مصلحت کوش بوڑھا کوئی نہ تھا سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علیؓ بن ابی طالب، جعفر طیارؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص مصعبؓ بن عمیرؓ، عبداللہؓ بن مسعود جیسے لوگ قبولِ اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے، ان سے زیادہ سن رسیدہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف، بلالؓ اور صہیبؓ تھے جن کی

عمریں ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھیں، ابو عبیدہؓ بن الجراح، زیدؓ بن حارثہ، عثمانؓ بن عفّان اور عمر فاروقؓ ۳۰ اور ۳۵ کے درمیان عمر کے تھے، ان سے زیادہ سن رسیدہ ابو بکر صدّیقؓ تھے ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ تھی۔ یعنی حضرت عبیداللہ بن حارث مطلبیؓ اور غالباً پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہم عمر تھے یعنی عمار بن یاسرؓ

آیت مذکور میں فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰی کے الفاظ ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے لیکن ایمان کے ساتھ لام کا صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت کے معنیٰ دیتا ہے یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہنے پر چلنا۔ پس دراصل اِن الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ موسٰیؑ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوتِ اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا، پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسٰیؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسٰیؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کے اُمتی تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدّتِ دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیر دستی سے پیدا ہوتی تھی۔ ان میں اتنا بل بوتہ باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا عَلم لے کر خود اُٹھتے، یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسٰیؑ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا، اس

کا اندازہ بائیبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے :

"جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آرہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستہ پر کھڑے ملے۔ تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے۔ تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھناؤنا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دیدی ہے"

(خروج ۶ : ۲۰،۲۱)

توریت میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے :

"ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آکر اس کو بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے۔ بس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا"

انہی باتوں کی طرف سورۂ اعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا

(تفہیم القرآن)

اوّل حال تھا نوجوان مخلص ایمانداروں کا، دوسرا حال تھا عوام مصلحت کوشوں کا تیسرا حال اسی آیت میں ہے فرعون کے مظالم اور تشدّد اور سخت گیری کا۔

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○

"واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔

اس آیت میں فرعون کے متعلق لفظ مسرفین استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مسرفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطلب کے لیے کسی بُرے سے بُرے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تامّل نہیں کرتے، کسی ظلم اور کسی بداخلاقی اور

کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چوکتے۔ اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد نہیں جس پر جا کر رُک جائیں۔

حضرت موسیٰؑ کا خطاب

قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○

"موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ" لوگو" اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جا سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی اور حضرت موسیٰؑ ان کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔

صادقُ الایمان نوجوانوں کا جواب

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

" انہوں نے جواب دیا" ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔"

ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دُعا کہ" ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے، گمراہی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اُٹھتے ہیں تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا

لہ تفہیم القرآن۔ یونس۔ ۸۵

ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلے میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے اور ان لوگوں کو الٹا برسرِ باطل ثابت کر دے اور اپنے ضمیر کی اس خلش کو مٹائے جو ان کی دعوتِ اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخر کار اسی طاقت کے حق میں ہوتا ہے جس کا پلہ بھاری رہے خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے' وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور آخر کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا۔ دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنہ وقت نے دے رکھی تھی، تیسرا گروہ فیصلہ کرتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں' یا ان سے بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا حادثہ ہو جائے تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدتہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اُٹھنے کا

امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنیٰ خیز دُعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا اور ہماری سعی کو دُنیا میں بارآور کر دے تاکہ ہمارا وجود تیری خلق کے لیے سبب خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔

دعوت اسلامی کامیابی کی منزل تک

حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال لینا گوارا کر لیں، وہی دعوت حق کے علمبردار ہوتے ہیں۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ط إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ
آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَا
مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۝ هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا
اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً ط لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ
بَيِّنٍ ط فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝

(الکہف : ۱۳ تا ۱۵)

"ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے اِن کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے، جب وہ اُٹھے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔

۱؎ تفہیم القرآن سورۃ الکہف ۱۳ تا ۱۵۔

(پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) "یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے، یہ لوگ اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے ؟۔ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے ؟"

یہ وہ حالات ہیں جو اصحاب کہف کے چند نوجوان جب عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تو انہیں درپیش آئے، اصحاب کہف کا ایمان لانا اور کھل کر لوگوں کے سامنے برملا کھڑے ہوکر یہ کہنا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو بیجا بات کریں گے"۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے قوم اور گرد و پیش کے لوگوں پر بھرپور تنقید کرتے ہیں کہ یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے ؟ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ صرف جھوٹ ہی نہیں بلکہ یہ بہت بڑا ظلم ہے، کیونکہ ربِّ کائنات کو چھوڑ کر غیروں کو خدا بنانا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔

ان نوجوانوں کا یہ اعلان "اِفسُ" شہر میں تھا جو ایشیائے کوچک میں بُت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دُنیا بھر میں مشہور تھے، شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

(ملاحظہ ہو سائیکلو پیڈیا آف بائبیکل لٹریچر عنوان (EPHCOLI)

شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا، اس کا اندازہ اصحاب کہف کے اس فقرے سے کیا جا سکتا ہے جو اگلے رکوع میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے :

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ۝

(الکہف : ۲۰)

"اگر کہیں ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔"

جب وہ خوب سوچ سمجھ کر ایمان لاتے ہیں اور ان سنگین حالات میں اعلان فرماتے ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

"اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے۔"

یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

اسباب کے بجائے اللہ پر اعتماد

اصحاب کہف[1] کے ان نوجوان مسلمانوں کے ایمان اور اعلان حق سے دوسرا سبق جو ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ حق قبول کرنے والا دُنیا کے ظاہری اسباب پر اعتماد نہیں رکھتا بلکہ اس کا اعتماد فی الحقیقت اللہ پر ہوتا ہے اور وہ حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہ حق میں قدم اُٹھا دیتا ہے۔ اصحاب کہف کا صرف اللہ پر اعتماد جس قدر ناسازگار حالات میں اعلانِ حق تھا

---

[1] تفہیم القرآن۔ الکہف۔ ۲۰

اسی طرح جب وہ دعوتِ حق دیتے ہوئے ان مشکل حالات میں مبتلا ہوئے ہیں اور شہر افسس میں ان کا قیام ناممکن بنا دیا جاتا ہے تو ایک غار کی طرف پناہ لیتے ہوئے ان کی آپس کی گفتگو ایک نمایاں مثال ہے :

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝ (الکہف : ۱۶)

"اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے سروسامان مہیا کر دے گا۔

اللہ کی غیبی امداد

اس واقعہ سے جو اصحابِ کہف کے ضمن میں بیان ہوا ہے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاویہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں کہ کسی کو دو سو برس سُلا کر اس کو اس طرح اُٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہو اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اسی طرح جب باطل قوتیں، اگر اس دُنیا کی مادّی طاقتوں اور جملہ سامانِ حرب سے مسلح ہوں اور اس کے مقابل حق کے پاس کوئی مادّی طاقت نہ ہو اور بظاہر مقابلے کی کوئی صورت نہ ہو لیکن جب حق کو حق سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور باطل کو باطل سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے اور باطل کی جگہ حق کو قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور باطل اپنی پوری قوت کے ساتھ زور آزمائی پر اُتر آتا ہے اور بظاہر کوئی امکان نہیں نظر آتا ہے کہ حق جم سکے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ معجزانہ طریقے

سے حق کے قدم جما دیتا ہے اور باطل کے بادل غبار کی طرح چھٹ جاتے ہیں۔

حق و باطل کی کشمکش

سورہ کہف آیت ۶۰ تا ۸۲ میں حضرت موسیٰؑ اور عبدِ صالح (خضرؑ) کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے مقصود کفّار اور مومنین دونوں کو ایک حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر میں نگاہ بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کرلیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیف میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرماں برداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی خستہ حالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور محض اس لیے کہ لوگ ان کو نہیں سمجھتے۔ ان سے عام طور پر ذہنوں میں اُلجھنیں بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہوجاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں اور ہے تو چوپٹ ہے یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہوجاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانہ مشیت کا پردہ اُٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے۔ اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو یہ مشاہدات کب کرائے گئے ہوں گے تو اس قصے پر غور کرنے سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی نبوّت کے ابتدائی دور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغاز نبوّت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اسی طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان مشاہدات

کی ضرورت اس زمانے میں پیش آئی ہوگی جبکہ بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آرہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (واللہ اعلم) کہ اس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سرداران قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے، جو اس سے باز پرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہوکر پوچھ رہے تھے کہ خدایا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ پکار اٹھے تھے کہ:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ (یونس: ۸۸)

"اے پروردگار، تونے فرعون اور اس کے درباریوں کو دُنیا کی زندگی میں بڑی شان وشوکت اور مال ودولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دُنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟"

دعوتِ حق اور آزمائش

دعوت حق کو ابتدائی دور میں غیر مؤثر بنانے کے لیے تضحیک واستہزاء سے کام لیا جاتا ہے، پھر جھوٹے الزامات لگائے جاتے ہیں جب یہ حربے ناکام ہو جائیں تو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور جب یہ کارگر نہ ہوں تو پھر طمع اور لالچ دے کر داعیانِ حق کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے، جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تضحیک، استہزاء، الزامات، جور وستم، جھوٹے پروپیگنڈے

ؔ تفہیم القرآن: جلد ۲ ص ۳۰۸۔

اور مخالفانہ جتھ بندی تک نوبت پہنچی، اس کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ۝ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ۝ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ۝ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰٓ ۝

(العلق : ۶ تا ۱۰)

"ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے، تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے ؟"

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں اسلامی طریقہ پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اس سے روکنا چاہا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اس کے کہ حضورؐ اسلام کی اعلانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپؐ نے حرم میں اس طریقہ پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو آپؐ کو اللہ نے سکھائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس سے قریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپؐ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں، دوسرے لوگ تو اسے حیرت کی ہی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابوجہل کی آتشِ جاہلیت بھڑک اُٹھی اور اس نے آپؐ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اس طریقے سے حرم میں عبادت نہ کریں، چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں جن میں ابوجہل کی ان بیہودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا :

"کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں، لوگوں نے کہا: ہاں، اس نے کہا "لات اور عزیٰ کی قسم اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا"، پھر

لہ تفہیم القرآن۔ العلق ۶ تا ۹ آیات۔

ایسا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ گردن پہ پاؤں رکھے مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے، اس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا ؟" اس نے کہا کہ میرے اور ان کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پر تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ قریب پھٹکتا تو ملائکہ اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔

(احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ)

ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ اے محمدؐ کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا ؟ اور اس نے آپؐ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا اس پر اس نے کہا" اے محمدؐ تم مجھے کس بل پر ڈراتے ہو، خدا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں (احمد، ترمذی، نسائیؒ، ابن جریر، ابن ابی شیبہؒ ابن المنذر، طبرانی، ابن مردویہؒ)

مُسلمہ اخلاق کی پامالی

قرآن مجید میں سورۃ لہب ایک ایسا مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے، حالانکہ مکہ میں بھی اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ابولہب سے کسی طرح کم نہ تھے، سوال یہ ہے کہ اس دشمن کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے ؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے اور اس میں ابولہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملک عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اس

کے خاندان اور خونی رشتہ کی حمایت کے سوا، جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا، عرب کی اپنی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضورؐ کی شدید مخالفت کی، لیکن بنی ہاشم اور بنی مُطّلب (ہاشم کے بھائی مُطّلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ کُھلّم کُھلّا آپؐ کی حمایت کرتے رہے حالانکہ ان میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے تھے، قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے ان خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہو، وہ اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ وہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو کسی حالت میں اس کے دشمنوں کے حوالہ نہیں کر سکتے، اور ان کا اپنے عزیز کی پشت پناہی کرنا قریش اور اہل عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اس اخلاقی اصول کو، جسے زمانۂ جہالت میں عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابولہب بن عبدالمطلب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، حضورؐ کے والد ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے، عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا خصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو، تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا، لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایات محدثین نے

نقل کی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپؐ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت) عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز سن کر لوگوں نے یہ دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے، بتایا گیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہے، اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے، جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا اور جو نہ آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر پکارا، اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المطلب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آرہا ہے، اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضور کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تبًّا لک أَلِهٰذا جمعتنا؟ ستیاناس جائے تیرا، کیا اسی لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے۔

(مسند احمد۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)

ابن زیدؓ کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا کہ، اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا، اس نے کہا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اور آپؐ کیا چاہتے ہیں، اس پر وہ بولا تبًّا لِهٰذا الدِّین تبًّا أَنْ أَكُونَ وَهٰؤُلَاءِ سَوَآءً... "ناس جائے اس دین کا جس میں

میں اور یہ سب دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر)

مکّہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا، دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے اس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ) عقبہ بن ابی مقیط، عدیہ بن حمرا، اور ابن اور صدار الہذی بھی آپؐ کے ہمسائے تھے، یہ لوگ گھر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو چین نہیں لینے دیتے تھے، آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپؐ پر پھینک دیتے، کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے، حضور باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبدالمناف، یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟" ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ وطیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپؐ کے دروازے پر خار دار جھاڑیاں لاکر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپؐ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے۔

(بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، ابن ہشام)

نبوت سے قبل آپؐ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں، نبوّت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دین شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو، چنانچہ دونوں نے طلاق دیدی اور عُتَیبَہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں وَالنَّجمِ اِذَا ھَوٰی اور اَلَّذِی دَنَا فَتَدَلّٰی کا انکار کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف تھوکا جو آپؐ پر نہیں پڑا، حضور نے فرمایا: خدا اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتّے کو مسلّط کردے، اس کے بعد عُتَیبَہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوگیا، دوران سفر ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں، ابولہب نے اپنے ساتھی اہل قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی بددُعا کا خوف ہے، اس پر قافلے والوں

نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور پڑ کر سو رہے، رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقہ میں سے گزر کر عُتیبہ کو پھاڑ کھایا۔

(الاستیعاب لابن عبد البر، الاصابہ لابن حجر، دلائل نبوۃ لابی نعیم الاصفہانی، روض الانف للسُّہیلی)

روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملہ کو اعلان نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تبّت یدا ابی لہب کے نزول کے بعد پیش آیا تھا، اس امر میں اختلاف ہے کہ ابولہب کا لڑکا عتبہ تھا یا عُتیبہ، لیکن یہ ثابت ہے کہ فتح مکّہ کے بعد عتبہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عُتیبہ تھا۔

اس کے خبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑتا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام و نشان ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے یہ آپؐ کے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا، ربیعہؓ بن عباد الدِّیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نو عمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا، وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے"۔ اور آپؐ کے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھوٹا ہے، دین آبائی سے پھر گیا ہے"۔ میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے، لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد، بیہقی)

دوسری روایت انہی حضرت ربیعہؓ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ "اے بنی فلاں میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ میں وہ

کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے"، آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اسے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عزّیٰ سے پھیر کر اس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے، اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو"۔ میں نے اپنے چچا سے پوچھا یہ کون ہے، انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے"۔ (مسند احمد، طبرانی)

طارقؓ بن عبداللہ المحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ "لوگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو، فلاح پاؤ گے"۔ اور پیچھے ایک شخص ہے جو آپؐ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپؐ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو"۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (ترمذی)

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے، تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کی بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا، یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی مطلب پر فاقوں کی نوبت آگئی، مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکّہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ ہو گا اسے میں پورا کروں گا، چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا، پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیز بازار کے بھاؤ خرید لیتا۔ (ابن سعد و ابن ہشام)

مشکلات میں سکینت

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝
الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فَاِنَّ
مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ فَاِذَا
فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الم نشرح)

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو۔"[1]

اس کا مقصد و مدعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جس کا سامنا نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرتے ہی یکایک آپؐ کو کرنا پڑا، یہ خود آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم تھا جس کا کوئی اندازہ آپؐ کو قبل نبوت کی زندگی میں نہ تھا، اسلام کی تبلیغ کیا شروع کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہی معاشرہ آپؐ کا دشمن ہو گیا جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، وہی رشتہ دار، دوست، اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپؐ کو گالیاں دینے لگے جو پہلے آپؐ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، مکہ میں کوئی آپؐ کی بات سننے کا روادار نہ تھا، راہ چلتے آپؐ پر آوازے کسے جانے لگے، قدم قدم پر آپؐ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں، اگرچہ رفتہ رفتہ آپؐ کو ان حالات، بلکہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ سخت

---

[1] تفہیم القرآن۔ الم نشرح۔

حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی۔ لیکن ابتدائی زمانہ آپؐ کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ اسی بنا پر آپؐ کو تسلی دینے کے لیے پہلے سورۂ ضحیٰ نازل کی گئی اور پھر اس سورہ کا نزول ہوا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں، ایک شرح صدر کی نعمت، دوسری یہ نعمت کہ آپ کے اوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو نبوت سے قبل آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا، تیسری رفع ذکر کی نعمت جو آپ سے بڑھ کر تو درکنار، آپ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔

اس کے بعد ربِّ کائنات اپنے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور جس سے آپ کو سابقہ پیش آرہا ہے لمبا دور نہیں ہے بلکہ اس تنگی کے ساتھ ہی فراخی کا دور بھی لگا چلا آرہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ ضحیٰ میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا اور عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ ابتدائی دور کی ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپ فارغ ہوں تو عبادت کی مشقت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لو لگائیں۔

مزید فرمایا گیا:

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ۝
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ ٱلْأَبْتَرُ ۝ (الکوثر)

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا، پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔"

لہ تفہیم القرآن۔ سورہ الکوثر

اس سے پہلے سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضور اور آپ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دُور دور تک کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اس وقت آپ کو تسلی دینے اور آپ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں، سورہ ضحیٰ میں فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝

"اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور (یعنی ہر بعد کا دور) پہلے دور سے بہتر ہوتا ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔"

اور سورۂ الم نشرح میں فرمایا:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

"اور ہم نے تمہارا آوازہ بلند کر دیا"

یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے ان کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔"

یعنی اس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورۂ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی بھی دی اور آپؐ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیش گوئی بھی فرمائی قریش

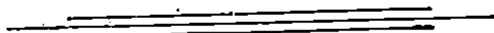
کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور ان کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہوگئی ہے، عکرمہؓ کی روایت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے گئے اور آپؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے بَتَرَ محمّد منّا (ابن جریر) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہوگئے ہیں جیسے کوئی درخت جڑ سے کٹ گیا ہو، اور متوقع یہی ہو کہ کچھ مدت بعد وہ سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے گا محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا" اجی چھوڑو انہیں، وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں، مرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں ہو گا۔ شمر ابن عطیہ کا بیان ہے کہ عقبہ ابن ابی معیط بھی ایسی ہی باتیں بالعموم کیا کرتا تھا، یہی باتیں ابولہب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کے انتقال پر کرتا پھرتا تھا کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جڑ کٹ گئی ہے۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی (عبادت کرتے تھے) اور ان کے شرک کو اعلانیہ رد کر دیا تھا، اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چھین لیا گیا تھا اور مارے کھدیڑے جارہے تھے، اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ لوٹ پڑا، اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے خوشیاں منائی جارہی تھیں اور ایسی باتیں بنائی جارہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مختصر ترین سورہ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دُنیا کے کسی انسان

کو کبھی نہیں دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی سُنا دیا گیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جاتی گی۔"

یہ تھے وہ حالات جن میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم دعوتِ دین اور اس کے تقاضے پورے کر رہے تھے۔

آنے والے ایام میں جو لوگ بھی دعوتِ دین کا عَلَم اُٹھائیں انہیں یہ تقاضے پُورے کرنے ہی ہوں گے۔"



آزمائش اور استقامت

ابتدائیہ

جب تک[1] کوئی نظام حیات اپنے محض فکری اور تصوّراتی دور میں ہوتا ہے نظامِ غالب اس کے وجود سے عموماً آشنا نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو اسے در خود اعتنا نہیں سمجھتا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ زندگی کی اس شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب پروانوں کا یہ اجتماع کچھ غیر معمولی سی صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے اور معاملات پر اپنی جُداگانہ نظر کھلم کھلا ڈالنے لگتا ہے تو نظامِ غالب چونکتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس جنگل میں ایک دوسرا شیر بھی پل رہا ہے جسے ختم کیے بغیر اس کی راجدھانی کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے پنجوں کے سارے نکیلے ناخن نکال کر اس پر جھپٹتا ہے یہیں سے اس تحریک کا دورِ ابتلا شروع ہو جاتا ہے یہیں سے وہ دعوت ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ کاروانِ نو اپنی مسافت کی سب سے زیادہ پُرصعوبت منزل میں داخل ہو جاتا ہے یہیں اس کی زندگی یا موت اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہیں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور زمانہ یہ فیصلہ کرنے پر تُل جاتا ہے کہ انسانوں کو اس نئے سانچے میں ڈھلنا ہے یا اس سانچے کو توڑ پھوڑ کر پھینک دینا ہے۔

---

[1] ابتدائیہ از سید اسعد گیلانی

ابتلاء

ابتلا کے اس دور میں الٰہی ہدایات پر چلنے والی تحریکوں اور انسانی فکر کی محتاج تحریکوں کے انداز برداشت میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور یہی دوران کے فرق کو بہت زیادہ نمایاں کرنے والا ہوتا ہے اخلاقی اقدار کے قیام کو انقلاب کا مقصود قرار دینے والی تحریکوں پر جب دور ابتلا آتا ہے تو ان کے کارکنوں کا اپنے مالک و آقا کی طرف رجوع پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے ان کا تعلق جہان و نہ مان کے پروردگار سے اور زیادہ قریبی ہو جاتا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو آزما رہا ہے کہ وہ اپنے نصب العین سے کتنی گہری نسبت اور اپنے مقصد سے کتنا پختہ عشق رکھتے ہیں وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو ضائع کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی کھوٹ کو آزمائش کی بھٹی میں تپا کر نکال دینا چاہتا ہے تاکہ ان کے دامن سے ذاتی خواہشات اور دُنیا طلبی کے سارے دھبے دُھل جائیں اور قلب کی لوح پر خدائے واحد کی پرستش کے نقش کے سوا اور کوئی نقش باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ ایسی تحریک کے کارکنوں پر جب کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ مایوسی، بوکھلاہٹ، بدحواسی اور شکست خوردگی کے جذبات سے قطعی بالاتر رہتے ہیں اور خلوص نیت کی جس نسبت سے انہوں نے اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کو اس کام میں لگایا ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ اپنی فطری کمزوریوں سے پاک رہتے ہیں بلکہ ان کے پاس کامیابی اور ناکامی کو تولنے کی وہ ترازو نہیں ہوتی جو عموماً دنیا میں رائج نظر آتی ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نصب العین کی راہ میں کتنا کچھ لٹایا ہے پھر جتنا کچھ انہیں لٹتا نظر آتا ہے اتنا ہی وہ اپنے نفع کے کھاتے میں درج کر لیتے ہیں جو کچھ وہ اس راہ میں لٹاتے ہیں اسی قدر وہ اپنا بوجھ ہلکا محسوس کرتے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر امانت ادا ہوگئی اسی قدر سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا یہاں تک کہ اگر اس راہ میں ان کی جان بھی چلی جائے تو ان کے لبوں پر دم واپسیں یہی

ہوتا ہے کہ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آزمائش جب ان کے چاروں طرف منڈلانے لگتی ہے تو جہاں وہ آزمائش سے پناہ اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اپنے رب سے دُعا مانگتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی راہ میں ثابت قدمی عطا فرمائے وہیں دوسروں کو محبوب حق کی راہ میں آزمائش میں مبتلا ہوتے اور عشق کے مقامات طے کرتے دیکھ کر رشک سے ان کا سینہ معمور ہو جاتا ہے اور وہ تمنّا کرتے ہیں کہ ان کا محبوب ان کو بھی قابل اعتنا سمجھے۔ ان کو بھی اس قابل جانے کہ ان کی راہ میں کانٹے بچھیں اور ان پر آوازے کسے جائیں ان کی رگوں کا خون بھی اس کی راہ کی گرد کو تر کرے اور ان کا سینہ بھی اس راہ میں چلنے کے جرم میں زخموں سے خونچکاں ہو یہ تمنّا ان کو بستروں پر تڑپاتی ہے کہ ان کا بستر ان کانٹوں سے معمور کیوں نہ ہوا جو ان کے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کی راہ میں بچھائے گئے اور راستوں کے پتھروں کا وہ نشانہ کیوں نہ بنائے گئے جو مصائب راہ حبیبؐ میں چلتے ہوئے دوسروں کو نصیب ہوئے ان سے وہ آخر کس نااہلی کی بنا پر بہرہ مند اور لذّت آشنا نہ ہو سکے انہیں وہم ہونے لگتا ہے کہ کہیں محبوب نے انہیں زرکم عیار تو نہیں قرار دے دیا کہ ان کی طرف کسوٹی نہیں بڑھائی گئی اور انہیں درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔

ابتلا کا دور گویا کسی تحریک کے کارکنوں کے لیے چھان پھٹک کا دور ہوتا ہے جس طرح ایک کسان اپنے کھلیان میں گیہوں کی بالوں کو پیہم کچل کچل کر اناج اور بھُس کو علیحدہ علیحدہ کر دیتا ہے اسی طرح ابتلا کا دور بھی کسی نصب العین کے دعویداروں کے انبار کو چھان پھٹک اور کچل کر گندم اور بھُس، مقصد کے شیدائیوں اور خواہشِ نفس کے پرستاروں کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ ابتلا کی یہ تپش تحریک کے سارے آماس کو ختم کر کے اس کی اصل فربہی کو نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ فاسد گندے خون کے

سارے مواد کو نکال کر جسم میں صرف صالح خون ہی باقی رہنے دیتا ہے اس دور سے گزر کر تحریک ایک نئی توانائی لے کر آگے بڑھتی ہے جیسے بیمار غسل صحت کے بعد تازہ دم ہو کر بستر سے اُٹھتا ہے۔ اس آگ سے گزر کر ملمع اور زر خالص ایک ہی تھیلی میں رکھے نہیں رہ سکتے دونوں کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے اور اسی حیثیت کے مطابق دونوں کا کام متعین ہو جاتا ہے۔

تاریخ میں آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی نے انا الحق کا نعرہ لگایا ہو اور اس کے سامنے دار کا تختہ نہ کھڑا کیا گیا ہو کسی نے وقت کے دریا کی مخالف سمت میں تیرنے کی کوشش کی ہو اور حالات کی تیز و تند لہروں نے اسے اُٹھا اٹھا کر پہاڑ پر پٹخ دینے کی کوشش نہ کی ہو اور کسی نے بُت خانے کے آداب کو توڑا ہو اور اسے آگ میں نہ جھونکا گیا ہو جب بھی کبھی کسی نے ایسی جرأت کی ہے۔ غاصب قوتوں نے اس کا راستہ روکنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر کے جان لیوا مقابلہ کیا ہے اور ایک بار تو نئی فکر کے علمبرداروں کو اپنے استبداد کے شکنجے میں کس کر ان کا پورا خون نچوڑ دیا ہے۔

پھر باطل تو ممکن ہے کہ غیر خالص زر بھی قبول کر لے، اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی جھوٹ اور کذب پر اُٹھتی ہے زندگی کے غلط زاویوں کو نمایاں کرنے کی دعوت ہی لے کر وہ اُٹھتا ہے وہ انہیں مسائل کا احاطہ کرتا ہے جو زندگی کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے والے ہوتے ہیں۔ پھر جھوٹ اور فکری گمراہی کے پاس ذوق لطیف اور اتنی نفاست کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں پوری پوری تمیز کر سکیں تو ان کی حمیت اور غیرت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ اس تمیز کے تقاضوں کو پورا کر سکیں پھر باطل نمود و نمائش کے لیے لکڑی کے کندوں کو بھی وردی پہنا کر میدانِ جنگ میں اپنے سپاہیوں کی گنتی بڑھانے کے لیے لا سکتا ہے۔ وہ ان کرائے کے لوگوں کے کندھوں پر اپنی بندوقیں رکھ سکتا ہے جن کے دل اس کے ظلم و تشدد سے نالاں ہوں لیکن حق تو اتنا باریک بیں واقع ہوا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنی

فوجی خدمات سے بَری قرار دے دیتا ہے جو چاہے اس کی ریاست کی وفاداری کا عہد کریں لیکن اس کے بنیادی اصولوں سے متفق نہ ہوں جبر و اکراہ کا اس کے ہاں سوال ہی نہیں ہے یہاں تو رغبت، طلب، تڑپ بلکہ جنون دیکھا جاتا ہے اور جس کے پاس جنون ہی ہے وہی اس کی تھیلی کا سب سے کھرا سکّہ ہے۔

انسان اپنی روزمرّہ کی زندگی کے معاملات میں جب اتنا دور اندیش واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کی تمیز کے لیے کئی طرح کے معیار رکھتا ہے۔ معمولی دوستی کے لیے وہ دوسرے میں ایثار، خلوص، ہمدردی اور وقت پڑنے پر کام آنے کے جذبے کو جانچتا ہے معمولی سودا خریدنے کے لیے دو سو بار مال کو دیکھتا جانچتا اور پرکھتا ہے اور اس وقت تک نہیں خریدتا جب تک مال کے کھرا ہونے اور اسے دیے جانے والے سکّے کی قیمت کے مطابق نہیں سمجھ لیتا تو آخر حق ایسا بے صبر گاہک کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کے کھرے کھوٹے مال سے دامن بھر لے اور ہر قسم کے انسان سے اپنے پُر اعتماد و دوستانہ تعلقات قائم کر لے۔ ایک معمولی بے شعور کل کی خبر سے بے خبر انسان جب اپنی دوستی سے پہلے دوسرے انسان کو پرکھتا ہے۔ وقت پڑنے پر کام آنے کی صفت کو دیکھتا ہے تب اس پر اعتماد کرتا ہے تو پھر جس کی نفاستِ طبع اور حمیت سے بڑھ کر نفاست اور حمیت دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی وہ کیسے ان صفات کو دیکھے، پرکھے اور جانچے بغیر قبول کر سکتا ہے چنانچہ فرمایا گیا:

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنّت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے ان پر سختیاں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسولؐ اور اس کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟" (بقرہ : ۲۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیے جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد

کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔" (توبہ : ۲۰)

"اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے جب اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کے ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے حالانکہ اگر تمہارے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آکر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے کیا اللہ اہلِ دُنیا کے دلوں سے واقف نہیں ہے مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہے اور منافق کون۔" (عنکبوت : ۱)

چنانچہ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لیے کہ اللہ کی راہ پر چلنا پھولوں کی سیج پر چلنا نہیں ہے بلکہ ایک وادیٔ پُرخار میں قدم رکھنا ہے اور اس وادی کے کانٹوں کے لیے اپنے تلووں کو پیش کر دینا ہی حقیقت میں اصل مُراد کا پالینا ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"جس کے پاؤں راہ خدا میں گرد آلود ہوں ان کو دوزخ کی آگ نہ چھُوئے گی۔"

یہاں گرد آلود ہونے سے مراد محض پاؤں پر گرد پڑ جانا ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں مصائب کو برداشت کرتے ہوتے اس کی راہ میں آگے ہی بڑھے جانا ہے اور اپنے حقیقی نصب العین کی راہ میں پیہم جدّوجہد کیے جانا ہے۔

حضرت خبابؓ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی مشکلات کی شکایت کی اس حالت میں کہ آپؐ کعبے کے سائے میں چادر پر ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ہم مشرکین کی سختیاں جھیل رہے تھے ہم نے کہا کیا آپ ہمارے لیے مدد طلب نہ کریں گے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"تم سے پہلے کے لوگوں کا یہ حال ہوا کہ مومن مرد کو پکڑا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا جاتا پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ دیا جاتا اور

دو ٹکڑے کر دیے جاتے اور گوشت ہڈیوں میں لوہے کی کنگھیاں پھیر دی جاتیں لیکن یہ سب کچھ اسے راہ حق سے باز نہ رکھتا۔ بخدا اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء یمن سے حضر موت تک سفر کرلے گا اور اسے خدا کے سوا اور بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا۔ لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔"

غرض یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اقامتِ دین جیسے بلند ترین مقصد کو لے کر اُٹھے لیکن اس کے ظرف کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک عشق الٰہی سے معمور ہے۔ لگن کی کتنی مقدار اسے حاصل ہے اپنی خواہشات نفس کی کتنی قربانی وہ دے سکتا ہے چنانچہ اگر ہم تاریخ کے ان تمام ادوار پر سرسری نظر ڈالیں جن میں راہ حق میں جدّوجہد کرنے والوں کے کارنامے ہمیں قدرے صاف نظر آتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جس کسی نے بھی دعوائے عشق کیا اس کے سامنے دار و رسن کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا گیا۔ اس امتحان میں کامیابی حاصل کیے بغیر کسی کو اس راہ میں قدم بڑھانے کا پروانۂ راہ جاری نہ ہو سکا اور واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں خدا کے بندوں نے جو جو کٹھن امتحان پاس کیے وہ تاریخ عزیمت کے درخشاں باب ہیں جنہیں انسانیت قیامت کے روز فخر کے ساتھ داورِ محشر کے روبرو پیش کر سکتی ہے۔

استقامت

حضرت نوح علیہ السلام کی نو سو سالہ دعوت حق سے کون باخبر نہیں ہے۔ عشق الٰہی کی اس مے مرد افگن کا کون حریف ہو سکتا ہے جس کا نشہ مسلسل نو سو پچاس سال تک اترنے نہ پایا اور اسی قوم میں مسلسل کام کرتے کرتے اور صالح انقلاب کے لیے تمام راہیں مسدود پانے کے باوجود پیمانہ صبر اس وقت تک لبریز نہ ہوا جب تک مشیت نے اس خطۂ زمین کو ہی عذابِ المناک سے لبریز نہ کر دیا۔ کسی قوم اور اس کے لوگوں کے درمیان ایک ہی پیامِ حق نو صدیوں تک پہنچاتے رہنا، پتھر کھاتے رہنا۔ پاگل اور

دیوانہ کہلاتے رہنا، حق کی لذت اور اس سے وابستگی کا ایک عظیم مظاہرہ ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ صبر و استقلال کا گویا ہمالہ ہے جسے مخالفت میں کام کرنے والی انسانی مساعی توڑ نہیں سکتیں۔ طوفان آتا ہے اور وہ لوگ جو حق کے اس کسان کی مسلسل محنت کے باوجود جھاڑ جھنکار سے زیادہ اپنی وقعت ثابت نہ کرسکے تھے غرق ہونے لگتے ہیں اور انہیں میں اس کا بیٹا بھی ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور جوان ہوا ہے۔

"بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ کشتی میں آجاؤ۔ آج کے دن خدا کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں ہے۔" باپ اپنے بیٹے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر اسے پُکارتا ہے۔

اور جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے کہ وہ تو ایک "عمل غیر صالح" ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے تو پھر وہ عظیم رہنما گڑگڑا کر اپنے رب سے استغفار کرتا ہے اس بات پر کہ اس نے اس بیٹے کے ساتھ خفیف سی قلبی لاگ بھی کیوں رکھی جسے حق کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی عذاب سے بھرپور تھپیڑے کے ساتھ ایک لہر بیٹے کو باپ کی آنکھوں کے ساتھ بہالے گئی لیکن باپ استغفار ہی کرتا رہا کہ اس نے اپنے رب سے وہ کیوں چاہا جسے اس کا رب نہ چاہتا تھا اس لیے کہ رشتہ تو وہ ہے جسے پروردگار قائم کرے نہ کہ وہ جسے لوگ رشتہ سمجھیں۔

اللہ کا حق

حضرت ابراہیم ؑ نے جب خدائی کے ایک احمق اور متکبر دعویدار کو یہ کہہ کر بوکھلا دیا کہ میرا رب تو سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال، تو عراق کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہوگئی۔ انہیں آگ میں جھونک دینے کے منصوبے بن گئے۔ خدائی کے دعویداروں کو حقارت سے ٹھکرا دینے کا یہ نتیجہ تھا جو دعویٰ بندگیٔ حق کا حضرت ابراہیم ؑ نے پیش کیا تھا اب اس کے امتحان کے یہ سامان تھے۔ پُورا خاندان بِھڑوں کا چھتہ بن گیا تھا پوری قوم کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ آگ میں جھونکے گئے اور بالآخر وطن

سے بے وطن ہوکر بادیہ پیمائی کرنی پڑی۔ بادیہ پیمائی کے ایک طویل دور کے بعد بیٹے کی قربانی کا مطالبہ ہوا اور باپ نے اپنے رب کے حکم کے مطابق چھری تیز کرکے بیٹے کے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھ کر اسے اوندھے منہ زمین پر لٹا دیا۔ یہ واقعہ آسمان کے نیچے اس رشتہ اور ناتہ کی زمین پر پہلی اور آخری بار ہوا۔ پوری کائنات دم بخود تھی کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے وہ حیران تھے جنہوں نے خدا کی زمین میں ابن آدم پر فساد کا الزام لگایا تھا کہ یہ انسان خدا کی محبت اور اطاعت میں اتنا غرق بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بیٹے کے حلق پر چھُری چلا دینے پر بھی تیار ہو جاتے اور خدا کی اطاعت و محبت کی تاریخ میں انسانیت نے یہ نمایاں ترین سنگِ میل نصب کر دیا کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے نہ ہاتھ تھرائے نہ آواز کانپی نہ لرزہ طاری ہوا اور چھری چل گئی۔ اس چھری نے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ ابن آدم خدا کی اطاعت میں ہر رشتے پر ہر متاعِ عزیز اور کائنات کی ہر دولتِ بے بہا پر چھری چلا سکتا ہے۔ انسانیت نے راہِ حق میں قربانی اور ایثار کا ایک معیار قائم کر دیا اور اس معیار پر انسانیت ہمیشہ فخر کر سکے گی۔ محبوب کی طرف سے آنے والے ابتلا کو دونوں ہاتھوں سے سینے سے لگانا حق سے ثابت قدمی اور استقامت کی توفیق چاہنا اور آنے والے امتحان میں اپنی ساری متاعِ حیات جھونک دینا یہی وہ طریق کار ہے جسے مومن کا ایمان اختیار کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بھی ایک طویل دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا اور اس لیے کہ ابتلا سزا نہیں ہے پرکھ ہے اگر یہ سزا ہو تو پیغمبروں پر کبھی نہ آتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کا کوئی بندہ جتنا اس کے نزدیک برگزیدہ ہوا اسی قدر سخت ابتلا میں اسے مبتلا کیا گیا، جتنا اونچا اس کا درجہ ہوا اتنا ہی کڑا امتحان اس کا لیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر فرعون نے مصر کی زمین تنگ کر دی۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جاتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا۔ اس طرح پوری قوم کی نسل کشی کے پروگرام پر ایک عرصہ تک عمل کیا جاتا رہا۔ بنی اسرائیل سے بدترین برتاؤ کیا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جادوگروں کی ایک بھیڑ اپنے

تمام جنتروں، منتروں اور شعبدہ بازیوں کے ساتھ چڑھ آئی اور اسی وقت ٹلی جب حق نے باطل کو پوری طرح شکست دے دی۔

حضرت عیسیٰؑ کو روم کے قیصر اور یہودیوں کی ماتحت ریاست سے سابقہ پڑا۔ یہ وقت تھا جب فریسیوں اور صدوقیوں کا طوطی بولتا تھا اور انہوں نے تورات میں تحریف کرتے کرتے اسے اپنی خواہشات کا تصدیق نامہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق کا آغاز ہوتے ہی یہ لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ دعوت اسلامی میں انہیں اپنے اقتدار کی موت اور کتاب الٰہی میں اپنی تحریفات کا پول کھلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہر فریسی اور فقیہ کو اپنی اپنی گدی اس دعوت کے سیل میں بہتی نظر آتی تھی۔ ہر مفاد پرست دین باز کے نزدیک اس دعوت کی موجودگی میں اس کا کاروبار چلتا نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ دعوت کے آغاز میں ہی ان کے فتنوں کے بند ٹوٹ گئے اور ان کے مکر و فریب کے جال بچھ گئے اس طرح سیدنا عیسیٰؑ کی دعوت کا آغاز ہی ابتلا سے ہوا اور آغاز کے ساتھ ہی مصائب کا وہ نقطۂ عروج آگیا جو ابتدا میں آئے تو کسی تحریک کے لیے انتہائی خطرناک اور اگر کچھ قوت پکڑ جانے کے بعد آئے تو عموماً مفید ہوا کرتا ہے۔ یہاں ابھی دعوت نے اپنی آواز بلند کی ہی تھی کہ چاروں طرف سے فتنے مرنے اور مارنے کے لیے جمع ہونے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے مختلف خطبات اور اقوال جو بائبل میں ملتے ہیں ان کا انداز خطاب وہی ہے جو ابتلا کے دور میں کسی تحریک کا لیڈر اختیار کرتا ہے وہ انہیں واضح طور پر راہ کی مشکلات سے آگاہ کرتا ہے انہیں کھول کھول کر اس راہ کے نشیب و فراز سے خبردار کرتا ہے۔ اس دور میں پیدا ہونے والی ان کی کمزوریوں کا تجزیہ کرتا ہے اور انہیں ثابت قدمی کی تلقین کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انداز تلقین بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ ابتدا سے ہی دعوت اس دور میں داخل ہوگئی جو ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ اوّل تو عام حالات میں کسی تحریک کا کارکن ہونا ہی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ پیہم حرکت اور

جدّ و جہد کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جب وہ تحریک ابتلا کے دور سے گزر رہی ہو تو پھر اس کا ساتھ دینا گویا خود اپنے آپ کو مقتل میں لا کھڑا کرنا ہے اپنے تلوؤں کو خود کانٹوں کے فرش پر رکھ دینا ہے۔ اپنا سر خود شکنجے میں دے دینا ہے۔ مسلّط نظام سے وابستہ اپنی اُمیدوں کا خود گلا گھونٹ دینا ہے اور حق کا کام چونکہ دبنا نہیں اُبھرنا ہے۔ شکست کھانا نہیں بلکہ شکست دینا ہے مایوس ہونا نہیں بلکہ مایوس کرنا ہے اس لیے وہ مصائب کے علی الرغم آگے ہی بڑھتا ہے۔ وہ باطل سے حق فروشی کا سودا کبھی نہیں کرتا اس کے ہاں کفر کے لیے صرف مرجانا ہی مقدر ہے۔ اس لیے وہ کبھی منافقانہ مصالحت نہیں کرتا۔

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہتا ہے وہ اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے"

یہاں صلیب اُٹھانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی موت کی سزا کے لیے تیار رہے اس لیے کہ اس راہ کے تقاضے یہ بھی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ذہن میں ریزرویشن (RESERVATION) رکھ کر آتا ہو تو اسے پہلے ہی اس راہ سے ہٹ جانا چاہیے اس لیے کہ ابتلا تو ہر اس شخص پر آئے گی جو اس نصب العین کا دعویٰ کرے گا اگر وہ ملازم ہوگا تو ملازمت سے برخاستگی کی شکل میں، اور اگر تاجر ہوگا تو تجارت میں خسارے کی شکل میں۔ اس کے آنے کے تو ان گنت پہلو ہیں۔ خالقِ کائنات جب اپنے سپاہی کو آزمائے گا کہ وہ جانباز سپاہی ہے یا کاٹھ کا پتلا ہے تو اس کی آزمائش کے ہزار راستے ہیں جو شخص ایک راستے سے بچے گا اس پر دوسرے راستے سے آزمائش آئے گی تاآنکہ وہ راہ حق سے فرار نہ اختیار کر جائے اور تاآنکہ وہ اس نصب العین سے ہی دست بردار نہ ہو جائے۔ جس نصب العین سے عشق کی گہرائی ناپنے کے لیے وہ آزمائش اس پر آئی ہوتی ہے۔

کسی نصب العین کے عشق کا دعویٰ کرنا کھیل نہیں ہے اس لیے کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے معمولی ایذا سے لے کر جان تک دینی پڑ جاتی ہے۔ کسی نظام باطل

میں رہتے ہوئے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا معمولی کام نہیں ہے اس لیے کہ ایسی کسی تحریک سے دل چسپی۔ ہمدردی یا رکنیت کے تعلق کا اعلان ہوتے ہی اس کے چاروں طرف کا ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ دوست اور عزیز جو اس کی محبت کا دم بھرتے رہے ہوتے ہیں اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ گویا اچانک وہ انسانوں کی بستی سے نکل کر بھیڑیوں کے جنگل میں آجاتا ہے اس کے خلاف سازشیں ہونے لگتی ہیں اس پر بہتان لگائے جاتے ہیں اسے غدار اور انتشار پسند کہا جاتا ہے۔ عدالتوں اور جیلوں کے حوالے کیا جاتا ہے، عبادت خانوں سے نکال دیا جاتا ہے اور اس کے لیے زندگی دوبھر کر دی جاتی ہے اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا تھا:

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں — آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کیے جاؤ گے"

پھر فرمایا:

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے، وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔"

اس قول کی رُوح اس آیت قرآنی کی رُوح سے کتنی ملتی جلتی ہے:

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے کہ تمہیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادریاں اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور گھر جو تمہیں پسند ہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ فرما دے، اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں

فرمایا کرتا۔" (توبہ : ۲۴)

تحریک کے بالکل ابتدا میں آنے والی اس ابتلا میں جو طریقِ کار اور طرزِ عمل ایک مومن کو اختیار کرنا چاہیے اور حق کے سپاہی کے صبر و تحمل کا جو معیار ہونا چاہیے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اس طرح پیش فرمایا:

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔"

اس کا نمونہ بھی نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے آغاز دعوت کے دور میں ملتا ہے جب مسلمانوں کو گرم ریت پر گھسیٹا جاتا، دہکتے کوئلوں پر لٹایا جاتا۔ پتھر کی گرم سلوں کے نیچے دبایا جاتا، مارا جاتا اور پیٹا جاتا اور عورتوں تک کو نیزے مار کر شہید کر دیا جاتا، لیکن تحریک کا ہر کارکن اسے صبر و تحمل اور بردباری سے برداشت کرتا رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابتلا میں اپنے ساتھیوں کے سامنے مطمع نظر کی بلندی اور دُنیا کے جھوٹے مدّعیوں کے سامنے بے خوفی و بے باکی کا یہ معیار پیش کیا:

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں لیکن رُوح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو پیدا کرتا ہے۔"

اس طرح صرف خدا سے اُمیدیں وابستہ رکھنے اور آخرت کے نامہ اعمال پر ہی نظر رکھنے کے لیے فرمایا:

"پھر یہ بے لاگ اصول پیش کر دیا تاکہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص ابتلا سے بچنے کے لیے دُنیا بازوں سے بھی دوستی رکھے اور خدا کے حقوق بھی ادا کرتا رہے ان سے بھی لاگ رکھے جو خدا کے اور اس کے دین کے قیام کے دشمن ہیں اور پھر بھی اس کی محبّت واطاعت خدا سے بے لاگ رہے۔"

"کوئی بھی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔"

تلوار کی دھار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ شریف میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تو اس تحریک کو ان تمام فطری مراحل سے گزرنا پڑا، جو ایک اصولی اور آئینی انقلاب برپا کرنے کے لازمی مراحل ہیں۔ ان تمام مراحل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پاکباز ساتھیوں نے اخلاق و عالی ظرفی اور صبر و تحمل کا جو نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے کسی دور کی کسی تحریک کے کارکنوں اور لیڈروں میں بھی نظر نہیں آتا۔ صبر و استقامت، ثابت قدمی، مقصد کا عشق، ہر غیر اللہ سے بغاوت، ہر بے اصولی اور ظلم سے مکمل بیزاری، خدا کے باغی اور بڑائی کے ہر دعویدار کے مقابلہ میں سربلندی اور بے باکی، گھر بار، مال اولاد، کاروبار برادری غرض تعلقات کو حق کی قینچی سے بے دریغ کاٹ دینے کی مثال اور شاید کہیں نہ مل سکے، پھر یہ آزمائش چند روزہ نہ تھی بلکہ برسہا برس رہی ایک نوعیت کی نہ تھی بلکہ ہر نوعیت کی تھی۔ ظلم بھی اور شفقت بھی، تشدد بھی اور لالچ بھی، مصالحت بھی اور جان لینے کی اسکیمیں بھی، برادری کا دباؤ بھی اور قوت و ہیبت کا استعمال بھی نہ گھر میں زندہ رہنے کی اجازت نہ باہر جا کر پنپنے دینے کا عزم، ان حالات میں عرب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں تحریک اسلامی چلی۔ اس آزمائش میں تحریک کے لیڈر سے لے کر ایک ایک فرد تک متاثر ہوا اور برسوں تک تختۂ مشق بنا رہا اس آزمائش سے بظاہر نجات کی کوئی صورت نہ تھی لیکن تحریک کے علمبرداروں کا عزم بتاتا تھا کہ یا تو کفر کی یہ تاریکی چھٹے گی یا اسلام کے نور کے داعی ایک ایک کر کے جانیں دے دیں گے۔ جو بھی اس راہ میں آگے بڑھا واپسی کی کشتیاں جلا کر آیا۔ جس نے بھی اس "مصیبت" کو چکھا وہ عیش و آرام تج کر اسی کا ہو رہا۔ مرد تو مرد عورتوں کا جذبۂ اسلام بھی ایسا نظر آیا کہ جس پر آسمان کے فرشتوں کو بھی رشک آئے۔

حضرت عمرؓ تحریک کے قائدؐ کا خاتمہ کرنے کے لیے ننگی تلوار لیے مکہ کی گلی میں سے گزر رہے ہیں کہ ایک راہرو نے سامنے سے آکر کہا :

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کرنے سے پہلے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں اور تشدد کا رُخ بہن کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ شدید ظلم اور مار سے جب بہن کا جسم لہو لہان ہو گیا تو اس نے بے تاب ہو کر کہا "عمر! جو چاہو کر لو اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا۔"

یہ جملہ جس حالت میں اور جس انداز میں کہا گیا ممکن نہ تھا کہ کوئی صحیح الفطرت آدمی اسے سُنے اور اس کے دل میں نشتر بن کر نہ اُتر جائے اس طرح اسلام کے ایک نازک ہاتھ نے کفر کا ایک مضبوط قلعہ فتح کیا۔

حضرت سمیہؓ کو دردناک اذیت دیتے ہوئے ابو جہل نے بالآخر ران میں نیزہ مار کر ختم ہی کر دیا لیکن ان کی زبان یہی کہتی رہی کہ "اب اسلام سے پھرنا ممکن نہیں۔"

حضرت بلالؓ کو ان کا مالک تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹتا رہا۔ لٹاتا رہا اور چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں کی سلوں کے نیچے دباتا رہا۔

حضرت خبابؓ کو دہکتے کوئلوں پر لٹایا جاتا رہا یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر نکل آتی تھی۔

اہل ایمان کو شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال تک فقر و فاقے میں مبتلا رکھا گیا۔ جہاں انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کو پانی میں بھگو کر اور آگ پر بھون کر کھانا پڑا اسلامی تحریک کے ان ابتدائی کارکنوں کو گلے میں رسّی ڈال کر گھسیٹا گیا۔ پیٹا گیا۔ معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا گیا اور بھوکے پیاسے قید و بند میں رکھا گیا اور حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا پھر وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا بلکہ وہاں سازباز کر کے حدودِ حبش سے بھی نکلوا دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

مکّہ کے ابتدائی تیرہ سال تحریک کے لیے دردناک ترین سال تھے اس سنگلاخ زمین میں اسلام کی جڑیں پیوست کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جن مشکلات

سے گزرنا پڑا، ان کا تصور بھی اس تحریک کے کارکنوں کو اسلام کی راہ میں جان دیدینے کا عزم بخشنے کے لیے بہت کافی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون، شاعر اور جادوگر کہا گیا جو لوگ آپ کو "امین" کہتے تھے اور حجرِ اسود کے نصب کرنے کی خوفناک نزاع میں جسے اپنا ثالث تسلیم کر چکے تھے انہوں نے تنگ کرنے کا کوئی حیلہ اور بہانہ اٹھا نہ رکھا۔ آپؐ کے سر مبارک پر حالتِ سجدہ میں اونٹ کی اوجھ ڈالی۔ آپؐ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اتنی شدت سے کھینچا گیا کہ آپؐ کا دم گھٹنے لگا۔ آپؐ کا مذاق اڑایا گیا، راہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ مکہ سے تنگ آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف دعوت حق دینے کے لیے گئے تو وہاں آپ کو پتھروں سے مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ لونڈوں اور غنڈوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا گیا اور آپ جب خستگی درماندگی اور مار سے تنگ آکر سائے میں بیٹھے تو آپ کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا گیا۔ اس وقت کائنات کے سب سے بڑے محسن انسان کا یہ عالم تھا کہ پاؤں لہولہان تھے اور آپ کی زبان پر تھا:

"میرے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ مجھے نہیں پہچانتی"۔

سختی اور تشدد کے مقابلے میں لالچ کی ایک دوسری ابتلا بھی تھی جب تمام قبائلِ قریش نے دعوت حق سے پریشان ہو کر آپ سے درخواست کی:

۱ ــــ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو ہم عرب کی دولت آپ کے قدموں پہ ڈھیر کرنے کے لیے تیار رہیں۔

۲ ــــ اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تمام قبائل کے سردار آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں۔

۳ ــــ اگر آپ کسی حسین ترین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لیے بھی تیار رہیں۔

لیکن آپ دعوتِ حق کو چھوڑ دیں۔ اس تحریص اور اس پیشکش کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تھا:

"خدا کی قسم! اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں
چاند بھی لا کر رکھ دو تو بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا جب تک میرے جسم میں
جان ہے۔"

تا آنکہ اس سرزمین میں کفر نے اسلام کے لیے آئینی اور اخلاقی ذرائع سے زیادہ عرصہ تک کام کرنا محال کر دیا۔ تا آنکہ کفر نے اسلام کی زندگی پر براہ راست چھاپہ مارنے کے منصوبے بنا لیے تا آنکہ یہ طے پایا کہ ہر قبیلے کا ایک ایک فرد ایک بلوہ کی صورت میں حضورؐ پر رات کے وقت سوتے ہوئے حملہ آور ہو تاکہ قصاص کا سوال پیدا نہ ہو اور بنی ہاشم زیادہ سے زیادہ فدیہ ہی لے سکیں، کفر کے یہ منصوبے اس مدبّر حقیقی سے چھپے ہوئے نہ تھے جس کا ہاتھ اس تحریک کی پشت پر تھا جو اپنی طرف چل کر آنے والے کی طرف دوڑ کر جاتا ہے اور جس کی راہ میں تیر چلانے والا ہاتھ گویا اس کا اپنا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہجرت کا عام حکم ہو گیا اور مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ کی طرف جانے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب مال، اولاد، جائداد، مکان، کھیتی باڑی، برادری اور خونی رشتے راستہ روکنے کے لیے ایک ایک کر کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور جانے والوں میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کا راستہ وہ روک سکے ہوں تحریک کا ہر فرد انہیں روندتا ہوا مدینے کی طرف چلا گیا۔ جس رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی وہی رات قیامت کی رات تھی جب آپؐ پر شیطان اپنے حواریوں کو لے کر حملہ آور ہونے والا تھا لیکن شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔

حضورؐ کا بستر اس رات موت کا بستر تھا اور اس بستر پر سونے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے جس نے اپنے آپ کو پیش کیا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے منصوبہ ناکام رہا اور آپؐ کی تلاش کوہ و دمن میں شروع ہو گئی۔ آپؐ کے سر کی قیمت مقرر ہو چکی تھی۔ مال و دولت اور سرخ اونٹوں کے پجاری تلاش میں مصروف تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ سفر کے ساتھ غارِ ثور میں پوشیدہ تھے۔

بار بار کھوج لگانے والوں کے پاؤں کی چاپ سُنائی دے جاتی اور اچانک ایک روز ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کی طرف آتا نظر آیا۔

صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہم دیکھ لیے گئے۔“

آپ نے فرمایا: ” لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا “ ”غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے“۔۔۔ اور اللہ واقعی ان کے ساتھ تھا۔ ان دو کے ساتھ تیسرا اللہ تھا جو ان کا حامی اور محافظ تھا۔

جنگِ بدر میں ایک طرف آہن پوش، ساز و سامان سے لدے پھندے ہزار سے زائد کافر تھے اور دوسری طرف بیچارگی اور بے سرو سامانی کے ساتھ تین سو تیرہ مسلمان تھے دنیا نے ایسے معرکے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے جب ٹوٹی ہوئی تلواریں لے کر چیتھڑوں میں ملبوس تین سو تیرہ نے ایک ہزار آہن پوش جرّار لشکر کے سامنے آنے کی کوشش و جرأت کی ہو۔

جنگِ اُحد کے اس منظر کا تصوّر کیجیے جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم گڑھے میں گرے پڑے تھے۔ جب آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے تھے۔ جب خود کی کڑیاں آپؐ کی پاک پیشانی میں گڑ گئی تھیں۔ جب حضرت فاطمہؓ آپؐ کے زخموں کو دھو رہی تھیں اور حضرت علیؓ پانی ڈال رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے تیر برس رہے تھے اور آپؐ پہاڑ کی طرح تیروں کی بارش میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پُکار رہے تھے اور ان کی ہمتیں بڑھا رہے تھے، پھر جب آپؐ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اُحد پہاڑ پر پناہ گزین تھے اور پیچھے کافر للکار رہے تھے۔ اس طرح دُنیا کا سب سے بڑا انسان، خدا کا فرستادہ امتحان گاہ میں سے گزر کر اپنی دعوتِ حق کے مراحل طے کر رہا تھا اور یہی وہ مراحل تھے جن سے گزر کر وہ دور آیا جبکہ رحمتِ کامل نے خون کے پیاسے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ ”آج معافی کا دن ہے، آج امن کا دن ہے“ اور انہی مراحل میں سے گزر کر وہ وقت آیا جب گروہ کے گروہ دین کے دائرے میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔

حق کو ایک تحریک کے طور پر لے چلنا اور اسے ایک نظام زندگی کے طور پر مسلّط کرنا اور اس کے مقابلے میں گہری جڑیں رکھنے والے نظام باطل کو اکھاڑ کر پھینکنا تو بہرحال ایک کٹھن کام ہے اور اس کے لوازم یقیناً زیادہ بڑے پیمانے پر قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور زیادہ وسیع آزمائش ان پر آتی ہے۔ تاریخ میں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی نے انفرادی طور پر بھی باطل کی کسی ایک بات کے مقابلے میں حق کی ایک بات پیش کی اور اس بات کی پشت پناہی کے لیے اپنی ہستی کو وقف کر دیا تو اس پر بھی آزمائشوں اور ابتلاؤں کا وہ ہجوم ہوا جس کا تصوّر بھی ایک مفاد پرست کے بس کا کام نہیں ہے۔

علم۔ باعمل

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حق بات کہی اور باطل کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا اور اگرچہ وہ تنہا تھے وہ کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے جس سے حکومت کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا لیکن اقتدار وقت نے انہیں بھی برداشت نہیں کیا۔ آپ کو قید و بند کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں بنی اُمیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے آپ کو کوڑوں کی شدید سزا دی یہاں تک کہ زہر دے کر آپ کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو منصور عباسی کے دور میں ۷ کوڑوں کی مار کے ساتھ اس سختی سے مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازوؤں سے اُکھڑ گئے لیکن حق پناہی کے جذبہ کا یہ عالم تھا کہ اسی حالت میں اونٹ کی پشت پر کھڑے ہو گئے جس پر ذلت و رُسوائی اور تشہیر کے لیے سوار کرا کے شہر میں پھرایا جا رہا تھا اور پکار کر اس حق کو بیان کیا جس کے جرم میں آپ کی یہ حالت کی گئی تھی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو مامون اور معتصم کے زمانے میں جس جس طرح ایذا پہنچائی گئی اور فتنۂ خلقِ قرآن کے سبب ان پر ظلم و ستم کیے گئے اس کی مثال ملنی محال ہے

جس وقت تمام علماء خلوت کے حجروں میں سر چھپائے بیٹھے تھے یا حکومت اور بادشاہ وقت کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اس مرد خدا نے حق کی پشت پناہی کا اعلان کیا جس کے جرم میں انہیں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پہنائی گئیں عین رمضان کے مہینے میں بھوکے پیاسے بیڑیوں میں محبوس اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دھوپ میں بٹھائے گئے اور پیٹھ پر لگاتار کوڑوں کی بارش اس طرح کی گئی کہ جلاد آگے بڑھ کر دو ضربیں لگاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے اور پھر تازہ دم جلاد آگے بڑھ کر دو ضربیں لگاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے اور پھر تازہ دم جلاد آگے بڑھ کر ضرب لگاتا تھا۔

جب ان سے کسی نے پوچھا کہ اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دیے گئے تو کیا آپ اس وقت مان لیں گے۔ آپ نے کہا "نہیں اس کائنات میں میرے سر کو جھکانے والی دو ہی چیزیں ہیں اللہ کی کتاب یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت"۔ شاہ کے کوتوال نے بتایا کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبلؒ سے بڑھ کر بارُعب نہیں پایا ہم عمال حکومت تو ان کی نظر میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور جب حیلہ جُو علماء نے آپ سے جا کر وہ روایت بیان کی جس سے جان کے خوف سے تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی تھی تو امامؒ نے کہا لیکن اس حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جب صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مظالم و مصائب کی شکایت کی تو فرمایا "تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں کھڑا کر کے آرے سے چیر دیا مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جُدا کر دیتی تھیں لیکن وہ اس کو بھی سہہ گئے اور حق سے منھ نہ موڑا"۔ حیلہ جُو علماء یہ جواب سُن کر واپس چلے گئے۔

جن کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

پھر وہ تحریک جو ہندوستان کی سرزمین میں پہلی اسلامی تحریک کہلا سکتی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پورے اسلام کے قیام کے لیے خلافت راشدہ کے بعد پہلی بار ہند میں ایک تحریک اُٹھائی گئی پہلی بار ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک کے لوازمات کے ساتھ ایک منظم جماعت قائم کی گئی یہ سید احمد شہیدؒ اور سید اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک اسلامی تھی جو دہلی اور بریلی سے اُٹھی بہار اور بنگال سے اپنے مجاہد اور ذرائع رسد فراہم کیے سرحد کے قبائل میں ڈیرہ ڈالا اور پنجاب و سرحد کے خونخوار سکھوں سے نبرد آزما ہوئی جس کا تذکرہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ تاریخ نے صحابہ کے بعد پہلی بار اس طرز کے لوگ دیکھے جو دن کو گھوڑوں کی پُشت پر اور رات کو جائے نماز پر ہوتے تھے اس تحریک نے کم و بیش پچاس برس تک سرحد میں جہاد کا علم بلند رکھا اس تحریک کے علمبرداروں پر جو آزمائشیں آئیں اور وہ ان میں سے جس عزم و استقلال، پامردی و جواں مردی اور صبر و توکّل سے گزرے وہ صبر کرنے والوں کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں فوجی بغاوت اور تحریک آزادی نے تمام راستوں کو پُرخطر بنا دیا۔ سرحد کے مجاہدوں کے لیے بہار اور بنگال سے جانے والی سپلائی کٹ گئی۔ فاقہ کشی نے مجاہدین کی حالت تباہ کر دی انہوں نے درختوں کی پتیاں اور کونپلیں کھا کھا کر گزارہ کیا۔ کئی ماہ تک غلّہ کا دانہ بھی نظر نہ آیا یہاں تک کہ خون کی اجابتیں آنے لگیں۔

پھر سازش کے مقدمات شروع ہوئے اور انگریز نے اس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں کی لاکھوں اور کروڑوں کی جائدادیں ضبط کر لیں ان لوگوں کی عزیمت کا عجب حال نظر آتا ہے کہ بنگال اور بہار سے پاپیادہ چلتے ہیں اور سرحد میں سینکڑوں میلوں کے فاصلے پر جا کر ایک نئے علاقے میں دشمن سے جنگ آزما ہوتے ہیں عزیمت کے یہی نمونے کسی تحریک کی جان ہوتے ہیں، سازش کے

مقدمات میں مجاہدین کی گرفتاریاں ہوئیں تو انہیں جن عذاب ناک جیلوں کی کال کوٹھریوں میں بند کیا گیا ان کی لمبائی چوڑائی ۵ × ۴ فٹ بتائی جاتی ہے۔ کوٹھری کی تنگی اور حبس کا یہ عالم تھا کہ قیدی کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہوتا اور قید و بند کی یہ کیفیت کئی ماہ تک رہی کھانا اتنا گھٹیا اور کم دیا جاتا تھا کہ جیل کی گھاس پر گزارا کرنا پڑتا رہا۔

مولوی محمد جعفرؒ تھانیسری نے انبالہ جیل سے لاہور کی تبدیلی کی عجب کیفیت لکھی ہے۔ کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی اور ہتھ کڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ پاپیادہ خلخال آہنی کو پہنے ہوئے منزل درمنزل چلے جاتے تھے۔

پھر لاہور پہنچ کر مزید عنایت ہوئی جس کا ذکر یوں کیا:

"لاہور جیل کا عطیہ ایک آہنی آڑا ڈنڈا تھا جو بیڑی میں ڈال دیا گیا۔ پھر بیڑی ہتھ کڑی اور ڈنڈے کے ساتھ ایک بہت موٹی آہنی زنجیر بھی بیڑیوں کے بیچ سے پہنا دی گئی جس کے بوجھ سے کوئی ہل نہ سکتا تھا۔ انڈمان کے لیے کراچی جاتے ہوتے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا لیکن ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔"

جھوٹے گواہوں کو جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کرنے کے لیے اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ بے بس ہو گئے۔ بعض مر گئے۔ مولوی جعفر نے اپنی روداد لکھی ہے کہ ان سے مجاہدین کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان پر کیا کچھ سختیاں ہوئیں:

"پارسن صاحب نے مجھے پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا جب مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا اور اس پر بھی میں نے نہ بتایا تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے دن سے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی پھر دوسرے دن پارسن صاحب مجھے الگ کمرے میں لے گئے جہاں لے جا کر مارنا شروع کیا۔ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت

امتحان کا ہے تو مجھ کو ثابت قدم رکھیو "

پھر مولانا یحییٰ علی صاحب کا ذکر کیا ہے جو امیر جماعت تھے :

" اس مار پیٹ کی وجہ سے جیل میں ہم سب حواس باختہ ہوتے لیکن امیر جماعت نہایت مسرور و خوش تھے۔ آپ کے چہرے پر کچھ بھی آثار رنج و محن کے نہ پائے جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے اور حضرت خبیبؓ کے شعر اکثر زبان پر رہتے :

" جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں۔
تو مجھے اس کی پروا نہیں
کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔
یہ سب اللہ کی راہ میں ہے۔
وہ چاہے تو بوسیدہ ٹکڑے ٹکڑے جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے "

چنانچہ جب پھانسی کے بجائے حبسِ دوام کی سزا دی گئی اور مجاہدوں کے لباس بدل کر ان کے داڑھی مونچھ اور سر کے بال بھی کتر دیے گئے تو مولانا یحییٰ علی اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اُٹھا کر کہتے :

" افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی راہ میں کتری گئی "

پھر مولانا کو ایک بڑے کنوئیں کے رہٹ میں جوت دیا گیا جسے آپ دو تین روز تک چلچلاتی دھوپ میں چلاتے رہے یہاں تک کہ خون کے پیشاب آنے لگے۔

زمانہ حال میں حق کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں میں مصر کی اخوان المسلمین کے حالات سے کون ناواقف ہے۔ اس اسلامی تحریک پر ایک "مسلمان حکومت" کی سختیاں کسی کافر حکومت کی سختیوں سے کم نہیں ہوئیں اس لیے کہ جب مسلمان کہلانے والا اقتدار اسلام کے درپے آزار ہوتا ہے تو اس کی ڈھٹائی اور شقاوتِ قلبی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے وہ ہر ظلم خدا اور رسولؐ کا نام لے کر کرتا ہے۔ ہر مظلوم کے گلے پر " بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر چھری چلاتا ہے۔ ہر معصوم کا خون کافر کہہ کر بہاتا ہے

اور ہر معصیت کو عین اسلام کا لیبل لگا کر انجام دیتا ہے اس کے شراب خانے بھی اسلامی شراب خانے ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں بد اخلاقی کے بدترین ذرائع بھی اسلامی کلب، اسلامی سنیما اور اسلامی رقص و موسیقی اور آرٹ کہلاتے ہیں ایسے ہی ایک اقتدار سے جب اخوان المسلمون کو سابقہ پیش آیا تو ان کے گلے پر چھری چلانے کے لیے بھی ایک مسلمان حکومت نے وہ تمام مظالم ایجاد کیے جس کی جرأت کسی کافر حکومت کو بھی نہیں ہو سکتی۔ ان کے لیڈر کو دھوکے اور فریب سے نہایت دردناک طریقے پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ان کی جماعت پر پورے ملک میں پابندی لگا دی گئی۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان نوجوانوں کو جن کا ایمان اپنے ملک کے لیے بیش بہا سرمایہ تھا جیلوں میں محبوس کر دیا گیا اور ان پر ایک طویل عرصے کے لیے مظالم اور تشدّد کا سلسلہ جاری رکھا گیا ان کو دردناک عذاب دیے گئے کوڑے لگائے گئے سانس روک دینے والی تنگ جیلوں میں انہیں ٹھونس دیا گیا اور وہ سب کچھ کیا گیا جو ایک فرد یا جماعت کو مٹانے، کچلنے اور ذلیل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے یہاں تک کہ بہترین افراد کو پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔

ایثار

یہ آزمائش اور ابتلا حق کی ہی نہیں باطل کی راہ میں بھی پیش آتی ہے ایثار اور قربانی کے بغیر باطل کو بھی مشکل ہی سے فروغ ہوتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپ کر ہی کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور قدرت اس کا امتحان کرتی ہے کہ اپنے مقصد سے کس کو کتنی محبت ہے جب کفار تک اپنے مقصد کے لیے قربانیاں دیتے اور ایثار کرتے ہیں جو نہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر۔ صرف دنیا کی چند روزہ راحت اور کامیابی کے لیے وہ اتنی عظیم الشان قربانیاں دیتے ہیں تو ان لوگوں کی ذمہ داریوں کا اندازہ لگائیے جن کا عقیدہ ہے کہ یہ زندگی امتحان گاہ ہے یہ آخرت کی کھیتی ہے اس چھوٹی سی زندگی کے بعد وہ دائمی زندگی شروع ہو گی جس کی اچھائی

یا برائی کا انحصار اس چھوٹی زندگی کی کمائی پر ہے۔ خدا ہے۔ وہ اس زندگی کا حساب لے گا اس ہدایت کے مطابق لے گا جو اس نے کمال مہربانی سے پہلے ہی پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک پہنچادی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ لکھا جاتا ہے ضائع نہیں ہوتا، ایک پیسہ بھی اگر ہم حق کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو اس کا انعام بھی ہمیں کئی گناہ ملے گا۔ پھر یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے یہ ہمارا نہیں ہے بلکہ خدا کا دیا ہوا ہے، یہ سب کچھ اسی کا ہے، اسی کی امانت ہے اگر ہم یہ سب کچھ بھی اسی کی راہ میں لٹا دیں گویا ہم نے دیانت داری سے جس کی امانت تھی اسے ہی لوٹا دی بلکہ اگر جان بھی اس کی راہ میں لوٹا دیں تو گویا ہم نے اسی کو وہ چیز دے دی جس نے ہمیں وہ دی تھی۔ یہ تصور اور عقیدہ رکھنے والے پر قربانی کے لحاظ سے کس قدر عظیم ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ پھر چونکہ اسلامی تحریک کا علمبردار یہ تصورات اپنے گہرے بنیادی ایمانیات کے طور پر رکھتا ہے اس لیے اس کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے۔ باطل مقصد کے لیے جدّوجہد کرنے والا اگر ایک پیسہ بھی اس راہ میں خرچ کرتا ہے تو اسے بجا طور پر اس پیسے کی جُدائی کا کچھ صدمہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ گویا اس نے اپنی ایک چیز صرف کی لیکن اس کے مقابلے میں اگر مومن راہ حق میں اپنی ساری متاع بھی لٹا دے تو اسے دُکھ کے بجائے فرحت ہوگی۔ اس لیے کہ اس کا تھا ہی کیا جو اس نے دیا۔ اسے وہی لذّت محسوس ہوگی جو ایک مقروض اپنا قرض ادا کر کے محسوس کرتا ہے۔

پھر جو حق ابدیت کا حامل ہے وہ ازل سے ایک ہی راستہ کی طرف بہتا اور چلتا آیا ہے اور آخر ازل تک ایک ہی راستے کی طرف چلا جائے گا۔ اس کے ہاں مقاصد اور نصب العین کا انتشار نہیں ہے پھر وہ اپنی راہ میں جدّوجہد کرنے والوں کو ابدی اور ہمیشہ کے انعامات دینے کا وعدہ کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ عیشِ ابدی کا سودا زیادہ قربانی اور ایثار چاہتا ہے۔

کامیابی کی منزل

حق کی راہ کی جدّو جہد میں ناکامی کی منزل کبھی نہیں آتی جو منزل تک پہنچ گیا اسے تو نفع و نقصان کی ترازو وؤں والے بھی کامیاب کہنے پر مجبور ہیں لیکن جو منزل کی راہ میں ہی جان دے گیا حق کی لغت میں وہ بھی کامیاب ہو گیا۔اس نے کامیابی زیادہ مختصر راہ سے حاصل کر لی اس لیے کہ وہ تو اپنا اثاثہ صرف راہ حق میں لگا دینے ہی کا مکلف تھا، جب وہ اس راہ میں اپنا دامن جھاڑ دیتا ہے تو اس کی کامیابی میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے اس نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی اور کارکن کی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ اس نے ذمّہ داری سے اپنا فرض نبھایا۔ نتائج کا حساب کتاب کرنا اس کا کام ہے جس نے اُسے ڈیوٹی پر مامور کیا ہے نہ کہ اس کا جس نے ڈیوٹی پر جان دے دی۔ ناکامی تو صرف ان کے مقدر میں ہوتی ہے جو آخرت میں اپنی کھیتی میں کانٹوں کی فصل کے سوا کچھ بھی اُگا نہ سکے۔ اور مورّخ نے بھی جن کے بارے میں شرحِ صدر سے گواہی دیدی کہ ناکامی حقیقت میں انہیں کا حصہ تھی جنہوں نے حق کا راستہ روکا وہ راستہ روکنے میں ناکام ہو گئے تو گویا مقدر نے انہیں دوسری ناکامی سے دوچار کر دیا اور اگر چند دن کے لیے ان کا پلڑا بھاری ہو گیا تو بھی ان کے پلڑے کی بے وزنی ان کے لیے مقدر ہے اس لیے یہ بات تو مسلّم ہے کہ جس طرح مومن کے نزدیک مایوسی نہیں آتی اس لیے کہ قنوطیت شیطان کا حصہ ہے اِسی طرح حق اور ناکامی کی منزلیں بھی مخالف سمتوں میں ہیں۔ یہاں چونکہ نفع اور نقصان کی ترازو ئیں نصب نہیں ہوتیں بلکہ ادائیگی فرض کی ترازو ہی فیصلے کرتی ہے اس لیے جس نے اس راہ میں اپنا فرض ادا کر دیا اس نے گویا فیصلے کی ترازو میں اپنا بھاری وزن ڈالدیا اور فرض کی کمی بیشی اسی درجہ کی ہوتی ہے جس درجہ کی کسی جگہ کفر اور اسلام کی کشمکش ہوتی ہے۔ کفر غالب ہو رہا ہو تو فرض بڑھ جاتا ہے ڈیوٹی سخت ہو جاتی ہے۔ کفر دم توڑ رہا ہو تو فرض کم ہو جاتا ہے ڈیوٹی نرم ہو جاتی ہے جیسے کسی بستی میں حفظانِ صحت

کا اہتمام ہو تو وہاں ڈاکٹر چین سے کہاں بیٹھ سکتا ہے وہ بستی کو بہتر سے بہتر بنانے کی تدابیر سوچتا رہتا ہے اور اگر وہاں وبا پھوٹ پڑے تو پھر اس کے لیے دن دن نہیں رہتا اور رات رات نہیں رہتی۔ ہر مریض کی طرف لپکنا اس کا فرض ہے چاہے وہ اسے رات کے بارہ بجے بُلائے یا دن کے بارہ بجے پھر اس کی ڈیوٹی کے حدود متعین نہیں ہو سکتے۔ وہ سراپا ڈیوٹی ہوتا ہے اس وقت اگر وہ اپنی تفریحات کے لیے وقت نکالنا چاہے تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔

خدا کے جن نیک بندوں کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور جنہوں نے اپنا مرنا جینا اسی "سب سے بڑے" کی رضا اور خوشنودی سے وابستہ کر دیا ہو ان کے دل سے چھوٹوں کا خوف نکل جاتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے انسانیت کو بڑی بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں اور جو کائنات کو صلح و عافیت امن و آشتی اور خیر و اخلاق سے لبریز کر دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ راہ حق کی مشکلات میں استقامت فی الدین ہی مومن کا حقیقی سرمایۂ حیات ہے۔

استقامت

اگرچہ خلوصِ ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل، مگر دین حق اس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے حق ایک ایسا باریک بین صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے آزمائشوں کی بھٹّی میں سے گزر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے معیار (STANDARD) کا کندن نہ نکل آئے وہ اپنے نام سے اس کو بازار میں لانے کی ذمّہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکّے اور ملمّع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (آل عمران : ۱۷۹)

"اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔"

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○

(عنکبوت : ۲، ۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) ان سب کو ہم نے تپایا ہے۔ پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ (بقرہ : ۲۱۴)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور ان کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا

مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۝ (توبہ : ۱۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔"

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ (عنکبوت : ۱۰، ۱۱)

"اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آکر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دُنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے ؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون ؟"

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ : ۱۵۵ تا ۱۵۷)

"ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دیدو ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں

نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔"

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ:

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ط (محمد : ۴)

"اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں کے ذریعہ سے آزماتا ہے۔"

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں ان کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو قائم کر دے، مگر اس نے جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدّعیوں سے مُمیّز نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافتِ الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اُٹھتا ہے یا نہیں جو سچّے ایمان دار، دُھن کے پکّے اور اپنی ہر دل عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس

ایک مُبارک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دُنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے رہے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر[1] اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی حفاظت کے لیے دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری ان کی گھات میں لگے ہوئے ہیں روس کا انقلاب جو ابھی پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے۔ اس کی تاریخ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے، مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانی دیتے رہے۔ سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے پھانسی پر چڑھائے گئے۔ جلاوطنی کی حالت میں برسوں مُلک مُلک کی خاک چھانتے پھرے اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا۔ خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب کہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصوّر بھی بمشکل ہی کیا جاسکتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے۔ یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت و خون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اُٹھا رکھی؟ کون سی ممکن التصوّر مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت

---

[1] یہ مضمون اپریل ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ [2] تحریک آزادی ہند کے سلسلے میں کسانوں کی ایک تحریک

نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اُٹھائیں، حبس دوام میں عمریں گزاریں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دے دیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارہ کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ اگر خاک وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمّت اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے۔ البتّہ وہ اپنی ذات کی حد تک ضرور کہہ سکتے ہیں:

اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۝

(المائدہ[1]: ۲۴)

"جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں۔"

آزمائشِ ہجرت

دعوتِ دین کا کام ہوگا تو اس راستے میں مشکلات اور آزمائشیں بھی آئیں گی، دعوتِ حق میں عام مداہنت، استقامت، وطن، مال، رشتہ و تعلق کی قربانی مطلوب ہوتی ہے سورۂ کہف اور سورۂ مریم کا نزول بعثتِ نبوّت کے تیسرے اور مخالفت و مخاصمت کے دوسرے دور کی سورتیں ہیں جو دور بعثتِ نبوّت کے ۵ھ تا ۱۰ھ تک چلتا ہے اس دور کے جو حالات تھے ان کا ذرا تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں سورتوں

لہ واضح رہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے ۴ مہینے بعد ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ ٢ھ تفہیم القرآن، ان سورتوں کے دیباچے۔

کے ذریعے سے جو اسباق دیئے گئے ہیں اس پر بات کی جائے گی۔

قریش کے سردار جب تضحیک، استہزا، اطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریک اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے قبیلے کے نومسلموں کو تنگ کرنا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کرکے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دے کر حتیٰ کہ سخت جسمانی اذیتیں دے کر انہیں اسلام چھوڑنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور موالی جو ان کے زیردست کی حیثیت سے رہتے تھے بُری طرح پیسے گئے مثلاً بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہؓ، امّ عبیسؓ، زنیرہؓ، عمارؓ بن یاسر اور ان کے والدین وغیرہم، ان لوگوں کو مار مار کر ادھ مرا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکّہ کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے ان سے کام لے لیا جاتا اور اُجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا چنانچہ صحیحین میں حضرت خبابؓ بن ارت کی یہ روایت موجود ہے کہ:

"میں مکّہ میں لوہار کا کام کرتا تھا، مجھ سے عامر بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اُجرت لینے گیا تو اس نے کہا میں تیری اُجرت نہ دوں گا جب تک تو محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا انکار نہ کرے۔"

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوشش کی جاتی اور جو معاشرے میں کچھ عزّت کا مقام رکھتے تھے ان کو ہر طریقے سے ذلیل و رسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ:

"ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے آپ خدا سے دُعا کیوں نہیں فرماتے؟" یہ سُن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا "تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے، ان پر

اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر ـــ آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو" (بخاری)

یہ حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ھ عام فیل (۵ھ نبوی) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

لَوْ خَرَجْتُمْ إِلَىٰ أَرْضِ الْحَبَشَةِ فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ وَهِيَ أَرْضُ صِدْقٍ حَتَّىٰ يَجْعَلَ اللَّهُ لَكُمْ فَرَجًا مِمَّا أَنْتُمْ فِيهِ۔

"اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو"

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شعیبہ کی بندرگاہ پر ان کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۲ مرد گیارہ عورتیں اور سات غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اس ہجرت سے مکہ کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابو جہل کے بھائی

سلمہؓ ابن ہشام، اس کے چچازاد بھائی ہشامؓ بن ابی حذیفہؓ اور عیاشؓ بن ابی ربیعہ اور اور اس کی چچازاد بہن حضرت ام سلمہؓ، ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہؓ، عتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خور کے سگے بھائی ابو حذیفہؓ سہیل بن عمر کی بیٹی سہلہؓ اور اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے تھے اسی لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں سب سے زیادہ سخت ہو گئے اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخر کار وہ مسلمان ہو گئے چنانچہ حضرت عمرؓ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعہ سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰؓ بنت ابی حشمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لئے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے اتنے میں عمر آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے کچھ دیر کے بعد کہنے لگے "عبداللہ کی ماں جا رہی ہو؟" میں نے کہا "ہاں، خدا کی قسم تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا خدا کی قسم اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔" یہ سُن کر عمر کے چہرے پر رقت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے ان پر کبھی نہ دیکھے تھے اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ "خدا تمہارے ساتھ ہو۔"

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ نے (جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت میں خوب تحفے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لئے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ "ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آگئے ہیں

اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لئے بھیجا ہے یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے بھی دین میں داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے" ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہل دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ" ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیئے، ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے" مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ :
"اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ کے لئے آئے ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔" چنانچہ نجاشی نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پاکر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم و کاست پیش کریں گے خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا، آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا ؟"

اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں پھر ان مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس امید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سُناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے نبی پر اُترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورہ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سُنایا جو

حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔"

دوسرے روز عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں سے بُلا کر یہ تو پوچھئے کہ عیسیٰؑ بن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بُلا بھیجا، مہاجرین کو پہلے سے عمرو کی چال کا علم ہو چکا تھا انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے۔ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے مگر پھر بھی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے، ہو جائے ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسول نے سکھائی چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامل کہا:

"هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَرُوْحُهٗ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ الْعَذْرَاۤءِ الْبَتُوْلِ"

"وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک رُوح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا۔"

نجاشی نے یہ سُن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا "خدا کی قسم، جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔" اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام تحائف یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

دعوتی اسباق

۱ــــ اصحاب کہف کے قصے میں اہل ایمان کو یہ سبق دیا گیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسہ پر اللہ کی زمین میں نکل جانا چاہیے۔

۲ــــ ہمیں مہاجرین حبشہ کے واقعات سے جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ ظالم معاشرے میں باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بہ تقدیر نکل جانا چاہیے دوسری بات جو اس قصے میں نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ بات ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں کی حیثیت سے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زاد راہ کے طور پر یہ سورہ مریم ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

۳ــــ تیسرا سبق جو ان دونوں واقعات میں سے ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت حق کو قبول کرنے والے جب تک اپنے عمل اور کردار سے یہ نہ ثابت کر دیں کہ جس حق کو انہوں نے حق تسلیم کیا ہے اس کے لئے برادریوں کے تعلقات کو تج سکتے ہیں وطن چھوڑ سکتے ہیں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتے ہیں لیکن دعوتِ حق کو نہ چھوڑ سکتے ہیں نہ چھپا سکتے ہیں اور نہ باطل کے آگے جھک سکتے ہیں اس وقت تک کامیابیوں کی منزل تک نہ پہنچ سکتے اور نہ خدا کی نصرت کے وہ مستحق ہو سکتے ہیں۔

۴ــــ چوتھا سبق ہمیں یہ ملتا ہے کہ جب حق قبول کرنے والے دُنیا کے سارے تعلقات اور ذرائع وسائل کو خدا کے بھروسے پر تن بہ تقدیر ترک کر دیتے ہیں تو اللہ ان کو نہیں چھوڑتا اور نہ ان کو ضائع ہونے دیتا ہے بلکہ وہ آخر کار محبوبِ خلائق ہو کر رہتے ہیں۔

اہل حق کا ایک تاریخی واقعہ

اور اس راستہ پر چلنے والوں کے لئے حرف تسلی :

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۡ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَاۤءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝ (مریم : ۴۶ تا ۵۰)

”باپ نے کہا ” ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے ؟ اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا، ابراہیم نے کہا سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا،

پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی “

یہ حرفِ تسلی ہے ان مہاجرین کے لئے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اُلٹے سربلند و سرفراز ہو کر رہے اسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے بلکہ وہ عزت پاؤ گے

جس کا تصوّر بھی جاہلیت میں پڑے کفّار قریش نہیں کر سکتے۔

دعوتِ حق اور محبوبیتِ خلائق

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ
لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ۝ (مریم : ۹۶)

"یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب
رحمٰن ان کے لئے دلوں میں محبّت پیدا کر دے گا"

یعنی آج مکّے کی گلیوں میں وہ ذلیل ورسوا کئے جا رہے ہیں مگر یہ حالت دیرپا نہیں ہے وہ وقت آئے گا جبکہ اپنے اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے وہ محبوبِ خلائق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھنچیں گے دُنیا ان کے آگے پلکیں بچھائے گی فسق وفجور رعونت اور کبر، جھوٹ اور ریا کاری کے بل پر جو سیادت وقیادت چلتی ہو وہ گردنوں کو چاہے جھکا لے دلوں کو مسخر نہیں کر سکتی اس کے برعکس جو لوگ صداقت، دیانت، اخلاص اور حسنِ اخلاق کے ساتھ راہ راست کی طرف دعوت دیں ان سے اوّل اوّل چاہے دنیا کتنی ہی کترائے آخر کار وہ دلوں کو موہ لیتے ہیں اور بد دیانت لوگوں کا جھوٹ زیادہ دیر تک ان کا راستہ روکے نہیں رہ سکتا۔

باطل قوتیں اور حق سے مقابلہ

(الف) سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ طرزِ عمل سکھایا ہے کہ جب باطل قوتیں آخری ٹکر لینے پر تل جائیں اور وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ اب ایک ہی کو جینا ہے حق کو یا باطل کو، لیکن باطل قوت کو اپنی کثرت اور اسباب پر اعتماد ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ جینے کا حق تو صرف اسی کو حاصل ہے اور اہلِ حق جبکہ قلیل اور بے سروسامان اور بے وسائل ہیں ان کو مٹنا ہے اور ان کو مٹا کر چھوڑیں گے تو اس وقت اللہ کا فیصلہ بھی آکر رہتا ہے۔ مکّہ معظمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئیں

تھیں یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے جوں جوں آپؐ کی دعوت پھیلتی گئی، کفارِ قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی جب تک انہیں یہ اُمید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے یا بہلا پھُسلا کر آپ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اس وقت تک تو پھر عناد کی شدت میں کچھ کمی رہی لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دیا کہ آپؐ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے اور سورۂ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جس کی بندگی تم کرتے ہو ان کی بندگی کرنے والا میں نہیں ہوں اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لئے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ، تو کفار کی دُشمنی اپنے پُورے عُروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھٹیاں سلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپؐ کو کوسا جا رہا تھا خفیہ مشورے کئے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپؐ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتا نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں آپؐ کے خلاف جادو ٹونے کئے جا رہے تھے کہ آپؐ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطین جن و انس ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپؐ کے خلاف اور آپؐ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپؐ سے دُور بھاگنے لگیں۔

بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے مثال کے طور پر ابوجہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا اس کی وجہ وہ خود بیان کرتا ہے کہ "ہمارا اور بنی عبد مناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان)، کا باہم مقابلہ تھا۔ انہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں انہوں نے عطیے دیے۔ تو ہم نے

بھی دیئے یہاں تک کہ وہ اور ہم برابر کی ٹکر ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اُترتی ہے بھلا اس میدان میں ہم کیسے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں ؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔"

(ابن ہشام - ص ۳۳۷-۳۳۸)

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوع صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں اور جادوگرنیوں کے شر سے اور حاسدوں کے شر سے اور انسانوں کے معبود کی ہر اس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے، یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰؑ نے اس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں ان کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ:

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ (المومن : ۲۷)

"میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔"

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (الدخان[1])

"اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے اس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔"

دونوں مواقع پر اللہ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں بڑے سروسامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا دونوں مواقع پر وہ طاقتور دشمنوں کے آگے دینِ دعوتِ حق پر ڈٹ گئے قوت ایمانی کے سوا ان کے

---

[1] ج ۴، ص ۵ تفہیم القرآن

پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ ان کا مقابلہ کر سکتے اور دونوں مواقع پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور معاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ تمہارے مقابلے میں ہم نے ربّ کائنات کی پناہ لے لی ہے ظاہر ہے یہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اس رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے اس کے مقابلے میں دُنیا کی سب طاقتیں ہیچ ہیں اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا تم جو چاہو کر لو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں تمہارے اور اپنے اور ساری کائنات کے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔

باطل کا مقدّر پسپائی اور فنا

سورۂ ابراہیم، اس آخری دور کی سورت ہے جبکہ کشمکش آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اس میں انبیاء سابقین اور ان کی مخالف قوتوں کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ انبیاء نے کس طرح واقعات پیش کر کے تفہیم کا حق ادا کیا اور ظالموں کے ظلم و تشدد پہ استقامت اور توکل علی اللہ کا مظاہرہ کیا اور جب ظلم حد سے گزرنے لگا تو اللہ نے ظالموں کی گردن پکڑ لی:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ط وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (ابراہیم : ۱۲)

"ہم کیوں نہ اللہ پہ بھروسہ کریں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیئے۔"

حق کے مقابل کفّار کا کردار

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ (ابراہیم: ۱۳، ۱۴)

"آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے"۔

یعنی "گھبراؤ نہیں" یہ کہتے ہیں کہ تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے مگر ہم کہتے ہیں کہ اب یہ اس سرزمین میں نہ رہنے پائیں گے اب تو جو تمہیں مانے گا وہی یہاں رہے گا۔[۱]

مجرمین کی تباہی کا الٰہی اُصول

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

"اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لئے) ایک پیغامبر نہ بھیج دیں"۔

یہ ایک اُصولی حقیقت ہے جسے قرآن بار بار مختلف طریقوں سے انسان کے ذہن میں بیٹھانے کی کوشش کرتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظام عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے پیغمبر اور اس کا لایا ہوا پیغام ہی بندوں پر خدا کی

---

۱ تفہیم القرآن ۲ تفہیم القرآن

حجت ہے یہ حجت قائم نہ ہو تو بندوں کو عذاب دینا خلاف انصاف ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ یہ عذر پیش کر سکیں گے کہ ہمیں آگاہ کیا ہی نہ گیا تھا پھر اب ہم پر یہ گرفت کیسی مگر جب یہ حجت قائم ہو جاتی ہے تو اس کے لئے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے جنہوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغام سے منہ موڑا ہو یا اسے پاکر پھر اس سے انحراف کیا ہو بے وقوف لوگ اس طرح کی آیات پڑھ کر اس سوال پر غور کرنے لگتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کسی نبی کا پیغام نہیں پہنچا ان کی پوزیشن کیا ہوگی حالانکہ ایک عقلمند آدمی کو غور اس بات پر کرنا چاہیئے کہ تیرے پاس تو پیغام پہنچ چکا ہے اب تیری اپنی پوزیشن کیا ہے، رہے دوسرے لوگ، تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے پاس، کب، کس طرح اور کس حد تک اس کا پیغام پہنچا اور اس نے اس کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار کیا اور کیوں کیا عالم الغیب کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا کہ کس پر اللہ کی حجت پوری ہوتی ہے اور کس پر نہیں ہوئی۔

گمراہ انسانی معاشرے اور حکمت ربانی

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا

(بنی اسرائیل : ۱۶)

"جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کرکے رکھ دیتے ہیں"

اس آیت میں حکم سے مراد حکم طبعی اور قانون فطری ہے یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے شرفاء فاسق ہو جاتے ہیں۔ ہلاک کرنے کے ارادہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یونہی بے قصور کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسانی آبادی

بُرائی کے راستے پر چل پڑتی ہے اور اللہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے تباہ کرنا ہے تو اس فیصلہ کا ظہور اس طریقہ سے ہوتا ہے۔

دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال لوگوں اور اونچے طبقوں کا بگاڑ ہے جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت مند اور صاحبِ اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہیئے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

باطل مٹ کر رہے گا

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝

"اور انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبّار دشمنِ حق نے منہ کی کھائی۔"

یہ ہے وہ آخری معرکہ جو پچھلی بگڑی ہوئی قوموں نے اپنے وقت کے انبیاء سے لڑا تھا اور وہ اپنے ظاہری اسباب اور جتھہ بندی پر مغرور تھے اور وہ اہل حق کے مقابلے میں اس غرور پر نکلے تھے کہ اہل حق بے وسیلہ اور کمزور ہیں ہم ان کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیں گے لیکن اہل حق اپنی ساری کمزوریوں اور بے وسیلہ ہونے کے باوجود جب پوری استقامت سے خدا پر اعتماد و بھروسہ رکھتے ہوتے ان کی ساری شان و شوکت کو نظر انداز کر کے میدان میں ڈٹ گئے تو اللہ نے ان کی نصرت فرمائی اور ان جبّاروں کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے ایک صاحبِ ولایت بزرگ کا کیا بہترین قول ہے۔ ع

چیست خدا وندا ہر کرا بیندازی نبا اندازی

اے خدایا تیرے عجیب نرالے کام ہیں، جب مفسدین کو ان کے ظلم و فساد کی وجہ سے توروئے زمین کو ان سے پاک کرنا چاہتا ہے تو تو انہیں ہمارے گلے ڈال دیتا ہے۔

اسی طرح مولانا رومؒ نے ایک بادشاہ کا ذکر کیا کہ جب اہل ایمان کو اس نے شرک پر مجبور کیا اور جب اہل ایمان نے انکار کیا تو اس نے ان سب کو آگ میں جلانے کا فیصلہ کیا تو اللہ کا غضب فوراً اس کے دامن گیر ہو گیا اور ایک غیبی آواز آئی ؎

بانگ آور چونکہ کار اینجا رسید　　پائے داری سگ کہ قہرے ما رسید

یعنی معاملہ جب اسی حد تک آن پہنچا تو غیبی آواز آئی کہ اے کتے یہیں ٹھہر، ہمارا غضب آیا ہی چاہتا ہے۔

اسی پر کہا گیا ہے ؎

تو مشو مغرور بر حلم خدا　　دیر گیرد سخت گیرد مر ترا
زود شو در یاب استغفار کن　　گریہ ہائے ہمچو ابر زار کن

ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں اس تاریخی بیان کے پیرایہ میں دراصل کفار مکہ کو ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے ذکر بظاہر پچھلے انبیاء اور ان قوموں کے واقعات کا ہے مگر چسپاں ہو رہا ہے وہ ان حالات پر جو اس سورت کے نزول میں پیش آ رہے تھے اس مقام پر کفار مکہ کو بلکہ مشرکین عرب کو گویا صاف صاف متنبہ کر دیا گیا کہ تمہارا مستقبل اب اس رویہ پر منحصر ہے جو دعوت محمدیہ کے مقابلے میں تم اختیار کرو گے اگر اسے قبول کرو گے تو عرب کی سرزمین میں رہ سکو گے، اور اگر اسے رد کر دو گے، تو یہاں تمہارا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا چنانچہ اس بات کو بعد کے واقعات نے ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا اس پیشین گوئی پر پورے پندرہ برس بھی نہ گزرے تھے کہ سرزمین عرب میں ایک مشرک بھی باقی نہ رہا۔

خدا کا قطعی فیصلہ

وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَسۡتَفِزُّوۡنَكَ مِنَ الۡاَرۡضِ لِيُخۡرِجُوۡكَ
مِنۡهَا وَاِذًا لَّا يَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيۡلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۶)

"اور یہ لوگ اس بات پر تُلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس زمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔"

یہ صریح پیشین گوئی ہے جو اس وقت تو صرف ایک دھمکی نظر آتی تھی مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرف بحرف سچی ثابت ہوگئی اس سورۃ کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور اس پر آٹھ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمین عرب مشرکین عرب کے وجود سے پاک کر دی گئی پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا مشرک بن کر وہاں نہ ٹھہر سکا۔

سُنّتُ اللہ کیا ہے؟

سُنَّةَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ
لِسُنَّتِنَا تَحۡوِيۡلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۷)

"یہ ہمارا مستقل طریقِ کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے۔ جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریقِ کار میں تم کوئی تغیّر نہ پاؤ گے۔"

یعنی سارے انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ جس قوم نے ان کو

۱؎ تفہیم القرآن

قتل یا جلاوطن کیا، پھر وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ نہ ٹھہر سکی پھر یا تو عذاب نے اسے ہلاک کر دیا یا کسی دشمن قوم کو اس پر مسلط کر دیا گیا یا خود اسی نبی کے پیروؤں سے اسے مغلوب کرا دیا گیا۔

نصرت الٰہی کی آمد کا اصول

ذہنی بے راہ روی اور احسان فراموشی بدترین جرائم ہیں :

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ○ (بنی اسرائیل : ۶۷)

"جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو انسان واقعی ناشکرا ہے۔"

سب گم ہو جاتے ہیں یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری اصلی فطرت ایک خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اور تمہارے دل کی گہرائیوں میں یہ شعور موجود ہے کہ نفع و نقصان کے حقیقی اختیارات کا مالک بس وہی ایک ہے ورنہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ جو اصل وقت دستگیری کا ہے اس وقت تم کو ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا دستگیر نہیں سوجھتا ؟ لیکن ہوائے نفس کی اتباع نے فطرتِ اصلی کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے کہ جب بھی اللہ ربّ العالمین اپنے احسانات سے نوازتا رہے تو اللہ کی شکرگزاری کے بجائے اپنے عیش و آرام کے دوسرے اسباب تلاش کرتے ہیں کبھی اپنی عقل و تدبیر کو اس کا موجب گردانتے ہیں اور کبھی اپنے دیوتاؤں کی نظر کرم کو۔

لیکن اپنی بداعمالیوں پر خدا کی گرفت سے بے خوف رہتے ہیں :

ل۔ تفہیم القرآن۔

أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل : ۶۸)

"اچھا، تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے، یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ ؟"

اور اس کی لطیف تدبیر یوں بھی ہو سکتی ہے :

أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً أُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝

(بنی اسرائیل : ۶۹)

"۔ اور کیا تمہیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے ؟"

وَإِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل : ۷۳)

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو اگر ایسا کرتے تو وہ تمہیں

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن ۳؎ تفہیم القرآن

اپنا دوست بنا لیتے"

یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں پیش آرہے تھے کفار مکہ اس بات کے درپے تھے کہ جس طرح بھی ہو آپؐ کو توحید کی اس دعوت سے ہٹا دیں جسے آپؐ پیش کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح آپؐ کو مجبور کر دیں کہ آپؐ ان کے شرک اور رسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت کر لیں اس غرض کے لئے انہوں نے آپؐ کو فتنے میں ڈالنے کی ہر کوشش کی، فریب بھی دیئے، لالچ بھی دلائے، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پروپیگنڈے کا طوفان بھی اٹھایا ظلم و ستم بھی کیا معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی مقاطعہ بھی کیا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لئے کیا جا سکتا تھا۔

ان مشکل حالات میں استقامت صرف اللہ کی نصرت سے ہوتی:

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۴)

"اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے"

دعوت کے اس مرحلہ میں داعی حق کی سودے بازی اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے:

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۵)

"لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے"

اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے ایک

ا۔ تفہیم القرآن ۲۔ تفہیم القرآن

یہ کہ اگر تم حق جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر بھڑک اُٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت، دونوں میں دوہری سزا دی جاتی دوسرے یہ کہ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلابِ بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

دعوتِ حق کا نازک مقام

سابقہ دونوں آیات کی روشنی میں دو باتیں واضح ہو کر سامنے آئی ہیں :

۱۔ ایک یہ کہ دعوتِ حق کس قدر اونچا مقام ہے اس کام کے کرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے بلکہ سوسائٹی میں سب سے اونچے / بلند ہمت اور اعلیٰ کردار کے لوگ ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ چونکہ یہ کام خدا کا اپنا کام ہوتا ہے اور اس کام کے کرنے والے جب بھی جہاں بھی اور جس حال میں کام کر رہے ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ قدم قدم پر رہنمائی بھی فرماتا ہے اور قوت بھی بہم پہنچاتا ہے

۲۔ دوسرا یہ کہ ایک نازک مقام بھی ہے کہ اگر دعوتِ حق دینے والے اپنی دعوت میں تھوڑی سی بھی لچک پیدا کریں اور باطل کے ساتھ سمجھوتے کی صورت پیدا کریں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اُصول پر عمل کریں تو دعوت کا کام کرنے والوں کی خیر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اہل حق دشوار گزار حالات میں بغیر کسی سودے بازی کے ڈٹ کر کام کریں تو اہلِ باطل کی خیر نہیں ہوتی۔ آخر انہیں مٹ کر رہنا ہوتا ہے۔

اہلِ حق اور استقامت

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا
وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (بنی اسرائیل : ۷۶)

"اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اُکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔"

باطل کے منصوبے اور اللہ کی سُنّت

موجودہ دور کی تحریک نفاذِ شریعت اسلامی اور اس وقت کا دورِ استبداد اس کی ایک زندہ مثال ہے جبکہ تحریک کے کارکنوں نے پوری استقامت سے یہ ثابت کیا کہ وہ جان و مال دے سکتے ہیں لیکن وہ اس استبدادی دور کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو حکومت وقت نے ایک ہی رات کو لاکھوں افراد کو مروانے کا منصوبہ بنالیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی ہی انتظامیہ کو اس پر مسلّط کر دیا اور جس سپہ سالار کو اس نے کتنے ہی سینئر کمانڈروں کی حق ماری کر کے آگے بڑھایا تھا اور اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد اور اطاعت شعار کمانڈر انچیف اس کے خاتمے کا سبب بن گیا اور لوگوں نے اس عبرتناک واقعہ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

اس راہ میں کام کرنے والوں کو اللہ کی ہدایت و نصرت کس طرح حاصل ہوتی ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَكَفَىٰ
بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ۝ (الفرقان : ۳۱)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے

---

[1] تفہیم القرآن

اور تمہارے لئے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔

"دشمن بنایا!" یعنی آج جو دشمنی تمہارے ساتھ کی جا رہی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے جب کبھی کوئی نبی حق اور راستی کی دعوت دینے اُٹھا تو وقت کے سارے جرائم پیشہ لوگ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے یہ مضمون سورہ انعام میں بھی گزر چکا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ (الانعام: ۱۱۲)

"اور ہم نے اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں"

یعنی آج اگر شیاطین جن و انس متفق ہو کر تمہارے مقابلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمہارے ہی ساتھ پیش آ رہی ہو۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے لئے اُٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مشن کو ناکام کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئیں۔

"خوش آئند باتوں" سے وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اُکسانے کا کام لیتے ہیں پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ حق سے لڑنے کے لئے جو ہتھیار بھی مخالفین حق استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لئے بلکہ خود ان کے لئے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دُشمن بنایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانونِ فطرت یہی کچھ ہے، لہٰذا ہماری اس مشیت پر صبر کرو، اور قانون فطرت کے تحت جن حالات سے دوچار ہونا ناگزیر ہے ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔ اس بات کی اُمید نہ رکھو کہ اِدھر تم نے حق پیش کیا اور اُدھر ایک دُنیا اسے قبول کرنے کے لئے اُمنڈ آئے گی۔ اور سارے غلط کار اپنی غلط کاریوں سے تائب ہو کر اسے ہاتھوں ہاتھ لینے لگیں گے۔

رہنمائی سے مراد صرف علم حق عطا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ تحریک اسلامی کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لئے بروقت صحیح تدبیریں سمجھانا بھی ہے اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کھلیں ہر ایک پر اہل حق کی تائید میں کمک پہنچانا اللہ کا کام ہے دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہل حق کو حجتِ بالغہ عطا کرتا ہے اخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہل حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے تنظیم کا مقابلہ ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل پھاڑتا ہے اور اہل حق کے دل جوڑتا ہے انسانی طاقت کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص اور گروہوں کو لا لا کر اہل حق کی جمعیت بڑھاتا ہے۔ مادّی وسائل کی فراوانی ان کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتی ہے غرض کوئی پہلو مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہل حق کے لئے اللہ کافی نہ ہو اور انہیں کسی دوسرے سہارے کی حاجت ہو۔ بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمان و اعتماد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کے لئے جانیں لڑائیں۔

یہ بات نگاہ میں رہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصہ نہ ہوتا تو پہلا حصہ انتہائی دل شکن تھا اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بوجھ کر تیرے سپرد ایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دُنیا بھر کے کتے اور بھیڑیے تجھے لپٹ جائیں گے۔ لیکن اس اطلاع کی ساری خوفناکی یہ حرفِ تسلّی سُن کر دُور ہو جاتی ہے کہ اس جاں گسل کش مکش کے میدان میں اُتار کر ہم نے تجھے

اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں ایمان دل میں ہو تو اس سے بڑھ کر ہمّت دلانے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم آپ ہماری مدد اور رہنمائی کا ذمّہ لے رہا ہے اس کے بعد تو صرف ایک کم اعتقاد و بزدل ہی میدان میں آگے بڑھنے سے ہچکچا سکتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۶۹)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے"

"مجاہدہ" کے معنی کسی مخالف طاقت کے مقابلہ میں کشمکش اور جدّوجہد کرنے کے ہیں اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشاندہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش ہے مومن کو اس دُنیا میں جو کشمکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے اسے شیطان سے بھی لڑنا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا ہے اور بدی کے فائدوں اور لذّتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے اور اپنے نفس سے بھی لڑنا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لئے زور لگاتا رہتا ہے اپنے گھر سے لے کر آفاق تک کے ان تمام انسانوں سے بھی لڑنا ہے جن کے نظریات، رجحانات، اصول، اخلاق، رسم و رواج طرزِ تمدن اور قوانینِ معیشت و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں۔ اور اس ریاست سے بھی لڑنا ہے جو خدا کی فرماں برداری سے آزاد رہ کر اپنا فرمان چلاتے اور نیکی کے بجائے بدی کو فروغ دینے میں اپنی قوتیں صرف کرے یہ مجاہدہ ایک دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر لمحہ کا ہے اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے اسی کے متعلق حضرت حسنؒ بصری فرماتے ہیں:

لہ تفہیم القرآن۔

ان الرجل لیجاھد وماضرب یومامن الدھر بسیف۔

"آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی تلوار نہ چلائے۔"

"مجاہدہ" اسی سورہ عنکبوت آیت ۶ میں بھی مذکور ہے وہاں اس کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا وہ اپنی ہی بھلائی کے لئے کرے گا یہاں یہ اطمینان دلایا جارہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دُنیا بھر سے کش مکش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لئے کھول دیتا ہے وہ قدم قدم پر انہیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر ہر موڑ پر انہیں روشنی دکھاتا ہے کہ راہ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں جتنی نیک نیتی اور خیر طلبی ان میں ہوتی ہے اتنی ہی اللہ کی مدد اور توفیق اور معاونت بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔

راہ حق کے راستے کی رکاوٹیں

قَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

(یونس: ۸۸)

"موسیٰ نے دُعا کی" اے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دُنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا یہ اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟"

"زینت" یعنی ٹھاٹھ، شان و شوکت اور تمدّن و تہذیب کی وہ خوشنمائی جس کی وجہ سے دُنیا ان پر اور ان کے طور طریقوں پر ریجھتی ہے اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ ویسا ہی بن جائے جیسے وہ ہیں۔

"اموال" یعنی ذرائع اور وسائل جن کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے کے لئے ہر طرح کی آسانیاں رکھتے ہیں اور جن کے فقدان کی وجہ سے اہل حق اپنی

تدبیروں کو عمل میں لانے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

یعنی جن لوگوں کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور تمدّن وتہذیب کی خوشنمائی حاصل ہوجاتی ہے اور جنہیں دنیا کے ذرائع ووسائل میسّر آجاتے ہیں تو وہ صرف دعوتِ حق کا انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اُلٹا دوسرے لوگوں کو بھی دعوتِ حق کے قبول کرنے سے روکتے ہیں۔

دعوتِ حق میں صبر کی اہمیّت

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یونس : ۸۹)

"موسیٰ علیہ السّلام کی دُعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"

جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی کمزوری اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور اَئمۂ باطل کے ٹھاٹھ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اس کے باغی دُنیا پر چھائے رہیں اور شاید حضرت حق خود باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید نہیں کرنا چاہتے پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذرا سی دینداری پر راضی ہوکر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر وفسق کی سلطانی میں مل رہی ہو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اور ان کے پیروؤں کو اس غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے

ملہ تفہیم القرآن

کہ صبر کے ساتھ انہی ناموافق حالات میں کام کیے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ○ (یونس : ۱۰۹)

"اے نبی! تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یعنی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیرؤوں کو صبر کی تلقین کی گئی اور ناموافق حالات میں کام کیے جانے کی تاکید کی گئی اور جاہلوں اور نادانوں کے طرزِ عمل سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان ناموافق حالات میں صبر کی تلقین فرمائی گئی اور مسلسل کام کرنے اور حکم اللہ کی اتباع کا دیا گیا۔

مخالفین دعوت حق کا چھچھوراپن

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ○ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۚ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ○

(ہود : ۹، ۱۰)

"اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے اور اگر مصیبت کے بعد ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے، پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔"

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

یہ انسان کے چھچھورے پن، سطح بینی اور قلتِ تدبّر کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں آج خوش حال اور زور آور ہیں تو اکڑ رہے ہیں، فخر کر رہے ہیں، ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزاں بھی آسکتی ہے کل کسی مصیبت کے پھیر میں آ گئے تو بلبلا اُٹھے، حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے اور بہت تلملاتے تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدائی پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے پھر جب بُرا وقت گزر گیا اور بھلے دن آتے تو وہی اکڑ، وہی ڈینگیں اور نعمت کے نشے میں وہی سرمستیاں پھر شروع ہو گئیں۔

انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبّہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبر تمہیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب آئے گا، اور تم اس کی یہ بات سُن کر ایک زور کا ٹھٹھا مارتے ہو اور کہتے ہو کہ "دیوانے دیکھتا نہیں کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریرے اُڑ رہے ہیں۔ اس وقت تجھے دن دہاڑے یہ ڈراؤنا خواب کیسے نظر آ گیا کہ کوئی عذاب ہم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے تو دراصل پیغمبر کی نصیحت کے جواب میں تمہارا یہ ٹھٹھا اسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل تر مظاہرہ ہے۔ خدا تو تمہاری گمراہیوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمہاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ، مگر تم اس مہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کہ ہماری خوشحالی کیسی پائیدار بنیادوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چمن کیسا صدا بہار ہے کہ اس پر خزاں آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دعوتِ حق صبر و شکر کا راستہ

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝ (ہود : ۱۱)

"اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور
نیکو کار ہیں اور وہی ہیں جن کے لئے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"

یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے صبر کی صفت اس چھچھورے پن کی ضد ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلے ہوتے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویہ پر ہر حال میں قائم رہے اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولتمندی، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے اور کسی دوسرے وقت مصائب و مشکلات کی چکی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

دعوتِ حق اور سکونِ قلب

وہ دعوتِ حق صبر و ثبات اور سکونِ قلب کا ایک ایسا پختہ مینار قائم کریں کہ مخالفتوں کی آندھیاں اور فتنوں کے سیلاب بھی ٹکرا ٹکرا کر گزر جائیں تو ان کے سکونِ قلب پر داغ تک نہ آنے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحٰىٓ اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ
اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ
نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (ہود : ۱۲)

"اے پیغمبر! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف

ل تفہیم القرآن

وحی کی جارہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کہ وہ کہیں گے "اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُتارا گیا" یا یہ کہ "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا" تم تو محض خبردار کرنے والے ہو آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔"

اس ارشاد کا مطلب سمجھنے کے لئے ان حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مکہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے عین اس حالت میں جبکہ یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں اس بستی کا ایک آدمی اُٹھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے، خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تلا کھڑا ہے اور تمہارے لئے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اس مذہب حق اور اس نظام صالح کو قبول کر لو جو میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس شخص کے ساتھ اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے سوا کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے عام لوگ اسے مامور من اللہ سمجھیں اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تمدن کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری علامت نہیں ہے جو نزول عذاب کی نشاندہی کرتی ہو بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں علامتیں یہی ظاہر کر رہی ہیں کہ ان لوگوں پر خدا کا (اور ان کے عقیدے کے مطابق، دیوتاؤں کا بڑا فضل ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں ٹھیک ہی کر رہے ہیں ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا کہ چند نہایت صحیح الدماغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوا بستی کے سب لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کوئی ظلم و ستم سے اس کو دبانا چاہتا ہے کوئی جھوٹے الزامات اور اچھے اعتراضات سے اس کی ہوا اُکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی متعصبانہ بے رُخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے اور کوئی مذاق اُڑا کر، آوازے اور پھبتیاں کس کر اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اُڑا دینا چاہتا ہے یہ استقبال جو کئی سال تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا رہتا ہے جیسا

کچھ دل شکن اور مایوس کن ہو سکتا ہے ظاہر ہے، بس یہی صورت حال ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی ہمت بندھانے کے لئے تلقین فرماتا ہے کہ اچھے حالات میں پھول جانا اور بُرے حالات میں مایوس ہو جانا چھچھورے لوگوں کا کام ہے ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہٰذا جس تعصب سے جس بے رخی سے، جس تضحیک و استہزا سے اور جس جاہلانہ اعتراضات سے تمہارا مقابلہ کیا جا رہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے جو صداقت تم پر بذریعہ وحی منکشف کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزر تک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ "لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جبکہ کوئی اس کے سننے تک کا روادار نہیں ہے کوئی مانے یا نہ مانے، تم جسے حق پاتے ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کئے جاؤ، آگے سب معاملات اللہ کے حوالے ہیں۔

راہ حق میں بددلی اور دل شکستگی گناہ ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ (ہود: ۱۱۰)

"ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے)"

یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج اس قرآن کے بارے میں مختلف لوگ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں بلکہ اس سے پہلے جب موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی گئی تھی تو اس کے بارے میں بھی مختلف ایسی ہی رائے زنیاں کی گئی تھیں، لہٰذا اے محمدؐ! تم یہ دیکھ کر بددل اور شکستہ خاطر نہ ہو کہ ایسی سیدھی اور صاف باتیں قرآن میں پیش کی جا رہی ہیں اور پھر بھی لوگ ان کو قبول نہیں کرتے۔

مجرمین کی طویل مہلت پر بے صبری

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ

(ہود : ۱۱۰)

"اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کردی گئی ہوتی تو ان اختلافات کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔"

یہ فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لئے فرمایا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کے لئے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ جلدی سے چکا دیا جائے اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ فیصلہ وقت مقرر سے پہلے نہ کیا جائے گا اور یہ کہ دُنیا کے لوگ فیصلہ چاہنے میں جو جلد بازی کرتے ہیں اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

فیصلے کی گھڑی کا انتظار

وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۖ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۝ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝

(الحجر : ۸۵-۸۶)

"فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے محمدؐ! تم (ان لوگوں کی بے ہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو، یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے، جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن ہتھکنڈوں

ے تفہیم القرآن

سے یہ تمہاری سعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ لہٰذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی ضرورت نہیں مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

باطل کا غلبہ ایک عارضی دور

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
(الحجر : ۸۵)

"ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے۔"

یہ آیت سابقہ آیت ہی کا جزو اول ہے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلّی کے لئے فرمائی جا رہی ہے مطلب یہ ہے کہ اس وقت بظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستہ میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آ رہا ہے اس سے گھبراؤ نہیں یہ ایک عارضی کیفیت ہے مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے اس لئے کہ زمین اور آسمان کا یہ پورا نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر، کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ، لہٰذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لئے ہے نہ کہ باطل کے لئے اس کی مزید تشریح سورۂ ابراہیم حاشیہ ۲۵۔۲۶ میں اس طرح مذکور ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ (ابراہیم : ۱۸)

"جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ

۱ے تفہیم القرآن۔ ۲ے تفہیم القرآن

کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو وہ اپنے کئے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے۔"

یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ نمک حرامی، بے وفائی، خود مختاری اور نافرمانی و سرکشی کی روش اختیار کی اور اطاعت و بندگی کا وہ طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں ان کا پورا کارنامۂ حیات اور زندگی بھر کا سارا سرمایۂ عمل آخر کار ایسا لا حاصل اور بے معنی ثابت ہو گا جیسے ایک راکھ کا ڈھیر تھا جو اکٹھا ہو کر مدت دراز میں بڑا ٹیلہ سا بن گیا تھا، مگر صرف ایک ہی دن کی آندھی نے اس کو ایسا اڑایا کہ اس کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو کر رہ گیا ان کی نظر فریب تہذیب، ان کا شاندار تمدن، ان کی حیرت انگیز صنعتیں ان کی زبردست سلطنتیں ان کی عالیشان یونیورسٹیاں، ان کے علوم و فنون اور ادبِ لطیف و کثیف کے اتھاہ ذخیرے، حتیٰ کہ ان کی عبادتیں اور ان کی ظاہری نیکیاں اور ان کے بڑے بڑے خیراتی اور رفاہی کارنامے بھی، جن پر وہ دُنیا میں فخر کرتے ہیں سب کے سب آخر کار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے جسے یوم قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی اور عالم آخرت میں اس کا ایک ذرہ بھی ان کے پاس اس لائق نہ رہے گا کہ اسے خدا کی میزان میں رکھ کر کچھ بھی وزن پا سکیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ

(ابراہیم : ۱۹)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان اور زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟"

یہ سابقہ آیت کے ساتھ کی آیت ہے اور دلیل اس دعویٰ کی جو اوپر کیا گیا تھا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سُن کر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ زمین و آسمان کا عظیم الشان کارنامہ تخلیق حق پر قائم ہوا ہے نہ کہ باطل پر؟ یہاں جو چیز حقیقت اور واقعیت پر مبنی نہ ہو، بلکہ محض ایک بے اصل قیاس و گمان پر جس کی بنیاد رکھ دی گئی ہو

اسے کوئی پائیداری نصیب نہیں ہوسکتی اس کے لئے قرار و ثبات کا کوئی امکان نہیں ہے اس کے اعتماد پر کام کرنے والا کبھی اپنے اعتماد میں کامیاب نہیں ہوسکتا جو شخص پانی پر نقش بنائے اور ریت پر قصر تعمیر کرے وہ اگر یہ امید رکھتا ہے کہ اس کا نقش باقی رہے گا اور اس کا قصر کھڑا رہے گا تو اس کی یہ اُمید کبھی پوری نہیں ہوسکتی کیونکہ پانی کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ نقش قبول کرے اور ریت کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ عمارتوں کے لئے مضبوط بنیاد بن سکے۔ لہٰذا سچائی اور حقیقت کو نظر انداز کرکے جو شخص باطل اُمیدوں پر اپنے عمل کی بنیاد رکھے اسے ناکام ہونا ہی چاہیئے یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ سُن کر تمہیں حیرت کس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی اس کائنات میں جو شخص اپنے آپ کو خدا کی بندگی و اطاعت سے آزاد فرض کرکے کام کرے گا یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان کر (جس کی فی الواقع خدائی نہیں ہے) زندگی بسر کرے گا اس کا پورا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا؟ جب واقعہ یہ نہیں ہے کہ انسان یہاں خود مختار ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا بندہ ہو تو اس جھوٹ پر، اس خلاف واقعہ مفروضے پر، اپنے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد رکھنے والا انسان تمہاری رائے میں پانی پر نقش کھینچنے والے احمق کا سا انجام نہ دیکھے گا تو اس کے لئے اور کس انجام کی تم توقع رکھتے ہو؟

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ (ابراہیم: ۲۴)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین سے لے کر آسمان تک چونکہ

۱؎ تفہیم القرآن

سارا انظامِ کائنات اسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اقرار ایک مومن اپنے کلمۂ طیبہ میں کرتا ہے اس لئے کسی گوشے میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکراتا کسی شے کی اصل اور جبلت اس سے اِبا نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اس سے متصادم نہیں ہوتی، اسی لئے زمین اور اس کا پورا انظام اس سے تعاون کرتا ہے اور آسمان اور اس کا پورا عالم اس کا خیر مقدم کرتا ہے:

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ (ابراہیم: ۲۵)

"ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے"

یعنی وہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے، اس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی پیدا کرتا ہے اس کے مقابلہ میں کلمۂ خبیثہ تباہ کُن درخت ہے جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے کڑوے کسیلے، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھٹکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

کلمہ طیبہ اور کلمات خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص بآسانی محسوس کر سکتا ہے جو دُنیا کی مذہبی، اخلاقی، فکری اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرے وہ دیکھے گا کہ آغازِ تاریخ سے آج تک کلمۂ طیبہ تو ایک ہی رہا ہے، مگر کلمات خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں کلمۂ طیبہ کبھی جڑ سے نہ اُکھاڑا جا سکا۔ مگر کلمات خبیثہ کی فہرست ہزاروں مردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ آج تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا اپنے زمانہ میں جن کلمات کا بڑا زور شور رہا ہے آج ان کا ذکر کیا جائے تو حیران رہ جائیں گے کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے۔

ل۱ تفہیم القرآن

پھر کلمۂ طیبہ کو جب، جہاں، جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنایا اس کی خوشبو سے اس کا ماحول معطّر ہو گیا اور اس کی برکتوں سے صرف اسی شخص یا قوم نے فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اس کے گردو پیش کی دُنیا بھی ان سے مالامال ہو گئی مگر کسی کلمۂ خبیثہ نے جہاں جس انفرادی یا اجتماعی زندگی میں بھی جڑ پکڑی اس کی سڑاند سے سارا ماحول متعفن ہو گیا اور اس کے کانٹوں کی چبھن سے نہ اس کے ماننے والا امن میں رہا، نہ کوئی ایسا شخص جس کو اس سے سابقہ پیش آیا ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں اسی مضمون کو سمجھایا گیا ہے جو اوپر یوں بیان ہوا تھا کہ "اپنے رب سے کفر کرنے والوں کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو" یہی مضمون اس سے پہلے ایک دوسرے انداز سے سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھاتوں کی تمثیل میں بیان ہو چکا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ قف (ابراہیم:۲۷)

"ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کی بنیاد پر دُنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔"

یعنی دُنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک پائیدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظامِ فکر اور ایک جامع نظریہ ملتا ہے جو ہر عقدے کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے شاہِ کلید کا حکم رکھتا ہے، سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے جسے زمانہ کی گردشیں متزلزل نہیں کر سکتیں۔ زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انہیں سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے، اور تلوّن کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں پھر جب وہ موت کی سرحد پار کر کے عالمِ آخرت کے حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی اور سراسیمگی و پریشانی ان کو لاحق نہیں ہوتی کیونکہ وہاں سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق

ہوتا ہے وہ اس عالم میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ گویا اس کی راہ ورسم سے پہلے ہی واقف تھے وہاں کوئی مرحلہ ایسا پیش نہیں آتا جس کی انہیں پہلے خبر نہ دے دی گئی ہو اور جس کے لئے انہوں نے قبل از وقت تیاری نہ کر رکھی ہو۔ اس لئے وہاں ہر منزل سے وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ ان کا حال وہاں اس کافر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے مرتے ہی اپنی توقعات کے سراسر خلاف ایک دوسری ہی صورت سے اچانک سابقہ پیش آتا ہے۔ اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے یعنی جو ظالم کلمہ طیبہ کو چھوڑ کر کسی کلمہ خبیثہ کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی مساعی کو پریشان کر دیتا ہے وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پا سکتے ان کا کوئی تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتا۔

حالات کی ناگواری پر صبر

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل : ۱۱)

"انسان خیر مانگنے کے بجائے شر مانگتا ہے۔ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔"

یہ جواب ہے کفارِ مکہ کی ان احمقانہ باتوں کا جو وہ بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ بس لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈرایا کرتے ہو۔ اوپر کے بیان کے بعد معًا یہ فقرہ ارشاد فرمانے کی غرض اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ بے وقوفو! خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگتے ہو؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ خدا کا عذاب جب کسی قوم پر آتا ہے تو اس کی کیا گت بنتی ہے؟

اس کے ساتھ اس فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مسلمانوں کے لئے بھی تھی جو کفار کے ظلم و ستم اور ان کی ہٹ دھرمیوں سے تنگ آکر کبھی کبھی ان کے حق میں نزول عذاب

ل؎ تفہیم القرآن۔

کی دُعا کرنے لگتے تھے، حالانکہ ابھی انہی کفار میں بہت سے وہ لوگ تھے جو آگے چل کر ایمان لانے والے اور دُنیا بھر میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے تھے اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان بڑا بے صبر واقع ہوا ہے ہر وہ چیز مانگ بیٹھتا ہے جس کی بروقت ضرورت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ بعد میں اسے خود تجربہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی دُعا قبول کرلی جاتی تو وہ اس کے حق میں خیر نہ ہوتی۔

صبر کی اہمیّت وضرورت

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ط هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ○

(مریم : ۶۵)

"پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔ کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟"

"ثابت قدم رہو"! یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیئے چلے جاؤ جو ایک اور رسول کی حیثیت سے تمہارے سپرد کی گئی ہے۔

"اس کا ہم پایہ"! اصل میں لفظ سَمِيًّا۔ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنیٰ "ہم نام" کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو الٰہ ہے، کیا کوئی دوسرا اللہ بھی تمہارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے تو پھر تمہارے لئے اس کے سوا اور راستہ ہی کون سا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے بندے بن کر رہو۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ

لہ تفہیم القرآن

مُسَمًّى ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ
طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ
وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ (طٰہٰ: ۱۲۹، ۱۳۰)

"اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔"

"جو باتیں بناتے ہیں ان پر صبر کرو" یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا اور ان کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے، اس لئے اس کی دی ہوئی اس مہلت کے دوران میں یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کریں اس کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام تلخ و ترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضۂ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمہیں نماز سے ملے گی جس کو تمہیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔

"شاید کہ تم راضی ہو جاؤ!" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس میں اپنے مشن کی خاطر تمہیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں اور اللہ کے اس فیصلہ پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناحق ظلم اور زیادتیاں کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی وہ داعی حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں دندناتے بھی پھریں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا

لہ تفہیم القرآن

جس سے تمہارا دل خوش ہوجائے گا یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (رکوع ۹)

"توقع ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر پہنچا دے گا۔"

اور سورہ ضحیٰ میں فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝

"تمہارے لئے بعد کا دور یقیناً پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

دعوتِ حق دائمی اور ہمہ گیر صبر

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ (الدھر: ۱۲)

"اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔"

یہاں صبر بڑے وسیع معنیٰ میں استعمال ہوا ہے بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری دُنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کئے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کردینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کرلینا جو راہ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل

ـلـه تفہیم القرآن

ہو، ہر اس نقصان اور رنج و اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویہ کے ثمرات اس دُنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے، اور عمر بھر کا صبر۔

مومن ایک دوسرے کو تلقین بالصبر بھی کریں (صبر کی تلقین کریں)

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد : ۱۷)

"(پھر اس کے ساتھ) یہ کہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور خلق خدا پر رحم کرنے کی تلقین کی۔"

جہاں تک نفس صبر کا تعلق ہے وہ تو قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے، اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے اخلاق کی بُرائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا پھر ایمان کی راہ اختیار

۱؎ تفہیم القرآن

کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک اور قوم اور دُنیا بھر کے شیاطین جن و انس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہو گا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جن کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کو دعوت حق کے مصائب صبر سے جھیلنے کی تلقین کی گئی ہے:

۱۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ

"پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ"

صبر کرو، یعنی وہ وقت ابھی دُور ہے جب اللہ تعالیٰ تمہاری فتح و نصرت اور تمہارے ان مخالفین کی شکست کا فیصلہ فرما دے گا اس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس تبلیغ میں پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔ اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ۔ یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے یعنی پہنچا دیئے گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا فیصلہ آنے سے پہلے بے صبری سے کوئی کام کیا تھا جس کی بنا پر وہ عتاب کے مستحق ہو گئے تھے:

۲۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (المعارج:۵) [1]

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کرو شائستہ صبر

یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایان شان ہے [2]

۳۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر:) [3]

اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جارہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی سارا عرب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائے گا اگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا اس سے باز رکھنے کے لئے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہوگی ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

۴۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝

"رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو"

"رب کے حکم پر صبر کرو" یعنی تمہارے رب نے جس کار عظیم پر تمہیں مامور کیا ہے اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔"

"بات نہ مانو" یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ اور کسی بدعمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترامیم و تغیر کرنے کے لئے تیار نہ ہو جو کچھ حرام و ناجائز

---

[1] [2] [3] تفہیم القرآن

ہے اسے برملا حرام و ناجائز کہو خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذراسی نرمی ہی برت لو اور جو عقائد باطل ہیں انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں اعلانیہ حق کہو، چاہے کفّار تمہارا منہ بند کرنے، یا اس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لئے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

مخالفتوں کے مقابلے میں اللہ کو وکیل بنائیں

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا

(المزمل: ۱۰)

"اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ"

الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو بالکل نظرانداز کر دو اور ان کی کسی بدتمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ احتراز بھی کسی غم اور غصّے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سُن کر اسے نظرانداز کر دیتا ہے اور دل پر میل تک نہیں آنے دیتا، اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا طرزِ عمل اس سے مختلف تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو یہ ہدایت فرمائی اصل میں تو آپؐ پہلے ہی سے اسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لئے دی گئی کہ کفّار کو بتلا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے ایسی باتوں کے جواب میں اپنے رسول کو بھی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے اور دوسرے مبلّغ بھی ایسا ہی کریں۔

ل تفہیم القرآن

تمام مخالفتوں کے مقابلے میں اللہ کو وکیل بنا لینے کی تلقین

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ○ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ○ (المزمل : ۹-۱۰)

"وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اسی کو وکیل بنا لو"

وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اسی معنیٰ میں ہم اُردو زبان میں وکیل کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالہ اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑ لے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمہارے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات تمہیں پیش آ رہی ہیں ان پر کوئی پریشانی تم کو لاحق نہ ہونی چاہئے تمہارا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں، تم اپنا معاملہ اسی کے حوالہ کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ اب تمہارا مقدمہ وہ لڑے گا تمہارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمہارے سارے کام وہ بنائے گا۔

لہ تفہیم القرآن

دعوتِ حق عظمت کا مقام

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ۳۳)

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی۔ جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"

اس سے پہلے کی آیات میں اہل ایمان کو بتایا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنّت کا مستحق بناتی ہے اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں ہے یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی جہاں اسلام کا اظہار اعلان کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے اس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان کھولی اس نے تو گویا ان درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ٹلنا بلا شبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجہ کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان

لہ تفہیم القرآن

رہوں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

راضی برضا رہیں

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝ (مریم: ۶۵)[1]

"تم اس کی بندگی کرو۔ اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟"

یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیع فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیتے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمہارے سپرد کی گئی ہے۔

دعوتِ حق میں سمجھ بوجھ کی اہمیت

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یونس: ۸۹)[2]

"اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"۔

جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے

۱؎ ۲؎ تفہیم القرآن

مقابلے میں حق کی کمزوری اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمہ باطل کے ٹھاٹھ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید حضرت حق خود ہی باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامت حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذراسی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ جائے جس کی اجازت کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور ان کے پیرؤوں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہی ناموافق حالات میں کام کئے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

دعوت حق میں نماز کی اہمیت

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ (ہود: ۱۱۴)

"اور دیکھو، نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں"

یعنی جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، ان سب کو رفع کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اسی نیکی سے اس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی

ؔ تفہیم القرآن

جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ (الحجر: ۹۷ تا ۹۹)

"ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ، اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔"

یعنی تبلیغ حق اور دعوت اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی تم میں صبر بھی پیدا کرے گی تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۸-۷۹)

"نماز قائم کرو" زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے اور رات

۱؎ ۲؎ تفہیم القرآن

کو تہجّد پڑھو یہ تمہارے لئے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر فائز کردے۔"

"نماز قائم کرو"، یہ حکم اسی سورۃ میں مشکلات و مصائب کے اس طوفان کا ذکر کرنے کے بعد فوراً دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ثابت قدمی جو ان حالات میں ایک مومن کو درکار ہے اقامت صلوٰۃ سے ہی حاصل ہوتی ہے اور آخری فقرہ میں مقامِ محمود کی خوشخبری دی ہے یعنی وہ ثابت قدمی جو اقامت صلوٰۃ سے حاصل ہو گی اس کا پھل آپ کو مقامِ محمود کا حاصل ہو گا یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبہ پر پہنچائے گا جہاں تم محمودِ خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو، اور تمہاری ہستی ایک قابلِ تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے مگر وہ وقت دُور نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری تعریفوں سے گونج اُٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہو گے قیامت کے دن نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقامِ شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبۂ محمودیت کا ایک حصّہ ہے۔

دعوتِ حق میں نماز باجماعت کی اہمیّت

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس : ۸۷)

"ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لئے مہیّا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرالو اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو"

اس آیت کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدد سے اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضعف ایمانی کی وجہ سے اسرائیل اور مصری مسلمانوں کے ہاں نماز باجماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے بکھرنے اور ان کی دینی رُوح پر موت طاری ہو جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سر نو قائم کریں۔ اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لئے تعمیر یا تجویز کر لیں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جایا کرے کیونکہ ایک بگڑی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی رُوح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم لازماً یہی ہو گا کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز اور مرجع ٹھیرایا جائے اور اس کے بعد ہی "نماز قائم کرو" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقررہ مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں "اقامتِ صلوٰۃ" جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نماز باجماعت بھی شامل ہے۔

اور مسلمانوں کو بشارت دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اہل ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور پژمردگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دور کرو، انہیں پُر اُمید بناؤ اُن کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ "بشارت دینے" کے لفظ میں یہ سب معنیٰ شامل ہیں۔

نماز اہل ایمان میں صبر، تحمل، قناعت، رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا کرتی ہے کہ جو دعوت حق کی خدمت کے لئے مطلوب ہے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ : ۱۳۲)

"اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو"

یعنی تمہارے بال بچے بھی اپنی تنگدستی وخستہ حالی کے مقابلے میں ان حرام خوروں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں یہ چیز ان کے زاویۂ نظر کو بدل دے گی ان کے معیار قدر کو بدل دے گی ان کی توجہات کا مرکز بدل دے گی وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اس عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دُنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

دین اسلام حق سے جُڑنے کا مضبوط رشتہ

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ (مریم : ۵۹)

"پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔"

"ضائع کیا" یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پرواہی برتنے لگے یہ ہر اُمّت کے زوال و انحطاط کا پہلا قدم ہے، نماز وہ اوّلین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شب و روز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محور سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندھن ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دُور اور دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کی اُمتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

"خواہشات نفس کی پیروی کی" یہ تعلق باللہ کی کمی اور اس کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ نماز کی اضاعت سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی، خواہشات نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے اخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکام الٰہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہو کر رہا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ : ۳۳)

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"

اس سے قبل اہل ایمان کو تسکین دینے اور ہمت بندھانے کے بعد ان کو ان کے اصل کام کی طرف رغبت دلائی جارہی ہے۔ گزشتہ آیت میں ان کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنّت کا مستحق بناتی ہے اب ان کو بتایا جارہا ہے کہ آگے کا درجہ جس سے بلند کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں، اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے اس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اسے

---

[1] تفہیم القرآن

پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلا شبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجہ کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے اور اس کام کو کرتے ہوتے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

دعوت حق میں مداہنت و مصالحت کی گنجائش نہیں

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ (القلم: ۸ - ۹)

"تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔"

یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر لیں۔ یا تم ان کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کر لیں۔[1]

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ○ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ○ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ○ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ○ (الکافرون[2]: ۱ تا ۶)

---

[1] [2] تفہیم القرآن

"کہہ دو کہ اے کافرو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت
تم کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت
میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت
تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت
میں کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین"

عزیمت حق کا تاریخی پس منظر

مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی سرداران قریش اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپؐ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپؐ کے اور ان کے درمیان رونما ہو چکی تھی اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں حضرت عبد اللہؓ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کئے دیتے ہیں ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کیا ہے انہوں نے کہا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں، اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں

کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی:

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ٥ (الزمر: ۶۴)

"ان سے کہو، اے نادانو! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟"

(ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی) ابن عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "اے محمد، اگر تم ہمارے معبود بتوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی (عبد بن حمید)

سعیدؒ بن میناء (ابوالبختری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن المطلب اور امیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے کہا۔ اے محمدؐ، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کئے لیتے ہیں اور اگر وہ چیز جو تم لے آئے ہو اس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے یا ہماری چیز اس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پا لو گے" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ہشام نے بھی سیرت میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

وہب ابن منبہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حمید، ابن ابی حاتم)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اس قسم کی تجویزیں

پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو ٹوک جواب دے کر ہمیشہ کے لئے ان کی اس اُمید کو ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کریں گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی برآت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن یہ انہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے قول اور عمل میں برآت کا اظہار کرنا چاہیئے اور بلا رورعایت کہہ دینا چاہیئے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ سورۃ اس وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ مر کھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانہ میں کافر و مشرک تھے، اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ، میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں ہیں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے معبود کی بندگی کے لئے تیار نہیں ہو اس لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے

لئے براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلانِ براءت اور اظہارِ بیزاری اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے در پے کیا گیا ہے چنانچہ سورہ یونس میں فرمایا "اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں" (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا "اے نبی، کہہ دو کہ لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو سُن لو کہ اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمہاری موت ہے۔" (آیت ۱۰۴)

سورہ شعراء میں فرمایا "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اب اگر یہ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں" (آیت ۲۱۶)

سورہ سبا میں فرمایا "ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی کہو، ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔" (آیت ۲۵، ۲۶)

سورۃ زمر میں فرمایا "ان سے کہو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں" آیت ۳۹، ۴۰)

پھر یہی سبق سورۃ طٰہٰ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ "تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے

ہو قطعی بے زار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" المتحنہ ۴)
قرآن مجید کی ان پے در پے توضیحات سے اس شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو، بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورہ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبی، ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو" (آیت ۱۴)

مومن کا کفر سے اعلان برأت

اس کی تفصیل بھی سابقہ تفصیلات جو سورۃ الکافرون کے ضمن میں عنوان بالا میں گزر چکی ہیں وہیں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:
مخالف قوتیں خواہ کتنی طاقتور ہوں اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتے۔ اور ان کی بالکل پروا نہ کی جاتے۔

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○

(المدثر: ۱ تا ۳)

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اُٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو"

یہ ایک نبی کا اوّلین کام ہے جسے اس دنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کر دے اور ڈنکے کی چوٹ پکارے دُنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اذان کی ابتداء ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر

کہہ کر اُٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس اُمّت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیساکہ ان آیات کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوّت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اُٹھنے کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اُٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند کر دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا، اسی لئے "اُٹھو اور خبردار کرو" کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ "اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو" اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں ان کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب ان سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمّت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو۔ وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

دعوت حق کے کارکنوں کو خدا پرستی کی راہ میں کیا کچھ کرنا چاہیے وہ یہی ہے کہ خدا کی بندگی کے مقابلے میں وطن اور قوم کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ

فَاعْبُدُوْنِ ○

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ"

یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف، مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے جہاں تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ، تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم و وطن اور ملک کو لات مار دے گا جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محب قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔ اللہ کی بندگی کے مقابلے میں جان کی پرواہ نہ کی جائے گی۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○

(العنکبوت: ۵۷)

"ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے"

یعنی جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے ہمیشہ رہنے کے لئے تو کوئی

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائق فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کئے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے اگر دنیا میں جان بچانے کے لئے ایمان کھو کر آئے اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا اور ایمان بچانے کے لئے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا، پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان۔

بندگی، سلامتی کا راستہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (عنکبوت : ۵۸)

"جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں۔ ان کو ہم جنّت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے؟ کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لئے۔"

یعنی اگر ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہوگی اور تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔[1]

بندگی کی راہ پر چلنے والوں کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں:

---

[1] تفہیم القرآن۔

اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (العنکبوت:۵۹)

"ان لوگوں کے لئے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

(الف) "صبر کیا ہے" یعنی جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہیں۔ جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جانوں پر جھیلا ہے اور منہ نہیں موڑا ہے ترک ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہیں کیا ہے۔ کفّار و فسّاق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی ہے۔

(ب) "رب پر بھروسہ کرتے ہیں" یعنی جنہوں نے بھروسہ اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور رہنے کے لئے مکانات پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا جو اسباب دنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لئے تیار ہو گئے اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے جنہوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہو گا اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دنیا میں بھی دستگیری فرماتے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

ہجرت ترقی درجات کا ذریعہ

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (العنکبوت : ۶۰)

لے تفہیم القرآن

"کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"

یعنی ہجرت کرنے میں تمہیں فکر جان کی طرح فکر روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا، خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں ان میں سے کون اپنا رزق اٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل جاتا ہے لہٰذا تم یہ سوچ کر ہمت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمہیں بھی دے گا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو سیدنا مسیح علیہ السّلام نے اپنے حواریوں سے فرمائی تھی، انہوں نے فرمایا:

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی

سارى شان وشوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبّس نہ تھا پس خدا
میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جاتے گی ایسی پوشاک
پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو وہ تم کو کیوں نہ پہنائے گا اس لئے فکرمند نہ
ہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے ان سب چیزوں کی
تلاش میں تو غیر قومیں رہتی ہیں۔ تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب
چیزوں کے محتاج ہو۔ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کی
تلاش کرو۔ یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی کل کے لئے فکر نہ کرو کل کا دن
اپنی فکر آپ کرے گا آج کے لئے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔"

(متی۔ باب ۶۔ آیات ۲۴ تا ۳۴)

قرآن اور انجیل کے ان اشارات کا پس منظر ایک ہی ہے دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالم اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اُٹھانے سے پہلے جان کے تحفّظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں درحقیقت اس طرح کے حالات بدلتے ہی ان لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لئے بے دھڑک تیار ہو جائیں انہی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حکمتِ تبلیغ

ابتدائیہ

اسلامی تحریک[1] انسانیت کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کے لئے اُٹھتی ہے یہ خالص ایک نظریاتی تبلیغی تحریک ہوتی ہے اور اپنے نظریہ کو پوری حکمت، دانشمندی اور عزیمت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

چند اصولی پہلو

اس طرح ہر اسلامی تحریک انسان کی پوری زندگی میں بندگی رب کے نفاذ کی دعوت لے کر اُٹھتی ہے وہ خدائی احکام کے نفاذ و ترویج کی دعوت دیتی ہے چونکہ احکام کا تعلق انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے اس لئے وہ بیک وقت فرد، معاشرے اور حکومت کی اصلاح کے لئے اقدامات کرتی ہے۔ فرد کی اصلاح کے لئے اسے بنیادی طور پر بگڑے ہوئے معاشرے میں سے صرف وہی افراد چھانٹنے ہوتے ہیں۔ جو اصلاح کو قبول کر کے اپنی عملی زندگی میں اسے نافذ کریں، اس لئے اس کی رُکنیت کے لئے اصلاح قبول کرنے والے اور اصلاح نہ قبول کرنے والوں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے تاکہ جس نوعیت کے معاشرے کی تشکیل کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ اس کی اجتماعی زندگی میں نظر آئے اور بندگی رب کے اثرات تحریک میں شامل افراد کی زندگیوں میں نمایاں ہوں پھر انہیں افراد کی مدد اور تنظیم سے وہ معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور معاشرے کی اصلاح کے تناسب سے ہی حکومت کی اصلاح کی کوشش

---

[1] ابتدائیہ از سید اسعد گیلانی

ممکن ہوتی ہے۔

اسلامی تحریک ایک باطل نظام کے غلبے کی حالت ہی میں نمودار ہوتی ہے۔ تاکہ اس غلبے کو توڑ سکے، اسلامی نظام کی موجودگی میں اقامتِ دین کی کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی خود اسلامی حکومت اور اس کے کارپرداز ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کا کام کرتے ہیں۔ باطل نظام کے غلبے کی حالت کافرانہ معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے اور بگڑے ہوئے نام نہاد مسلم معاشرے میں بھی۔

خالص کافرانہ معاشرے میں باطل نظام کے خلاف جدّو جہد کرنے میں تحریکِ اسلامی کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کے نتیجے میں معاشرے کا جو فرد بھی اسلامی دعوت کو قبول کرتا ہے اپنی ذات، خاندان اور معاشرے سے پہلے مرحلہ پر ہی لڑ کر اپنا مخلص، جاں نثار، ایثار پیشہ اور بہادر ہونا ثابت کر دیتا ہے اور دعوت کو قبول کرنے کے اوّلین مرحلے پر ہی اس تحریک کے بہترین کارکنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ تحریک اُسے سکھاتی ہے وہ تن من دھن سے قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ قیمتی سے قیمتی مفاد کو وہ تحریک کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور بڑی سے بڑی آزمائش کی بھٹی سے گزر جاتا ہے خواہشاتِ نفس سے لے کر عالیشان محلات تک کوئی اس کی راہ کا روڑا نہیں بن سکتا۔ لیکن بگڑے ہوئے مسلم معاشرے میں جہاں باطل نظام مسلط ہو گیا ہو وہ مدعیانِ ایمان کی بڑی تعداد کو اپنے غالب اثرات کے ساتھ مصالحت کرنے کے نتیجے میں اس مقام پر لے آتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لئے محض اقرارِ دعوت کافی نہیں ہوتا اس لئے کہ انحطاط کے جس مقام تک وہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ اقرارِ ایمان کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے ہوتے ہیں۔ تحریک اسلامی کو ایسے ایک مسلم معاشرے میں کام کرنے کی یہ ابتدائی سہولت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ اسے اسلامی دعوت کے منکرین سے سابقہ پیش نہیں آتا ہے کافی عرصہ کڑی آزمائش کے مراحل آنے تک لگ جاتا ہے لیکن ایسے معاشرے میں مخلص کارکنوں کی چھانٹی اور تیاری کے کام میں

بہت دیر لگ جاتی ہے اس لیے کہ اقرارِ ایمان کے ساتھ جو منافیِ ایمان اخلاقی بیماریاں انہیں لگی ہوئی ہوتی ہیں انہیں چن چن کر نکالنا نہایت مشکل اور طویل کام ہوتا ہے۔

اسلامی نظام صرف اسی معاشرے میں قائم متصوّر ہوتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے احکام اپنی پوری رُوح اور تفصیلات کے ساتھ نافذ ہوں اور اسے چلانے والے کارپرداز بھی اس کے پابند اور کاربند ہوں اور باطل نظام وہاں قائم ہوتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے احکام و قوانین کا نفاذ ہو چاہے انہیں چلانے والے نام نہاد مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، تحریک اسلامی کا مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام و قوانین کا اجرا کرے۔ یہی مقصد ہر مسلمان کی زندگی کا فرداً فرداً بھی متعین کیا گیا ہے۔

دعوتِ دین کے طریق کار کا مسئلہ

لیکن ہمارے پیش نظر ایک اسلامی تحریک کے اس طریق کار سے جو وہ اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے لئے اختیار کرتی ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنی دعوت کے لئے راستہ بناتی ہے، ظاہر ہے کہ جو طریقے عام دُنیوی طاقتیں اختیار کرتی ہیں وہ طریقے ایک اسلامی تحریک اختیار نہیں کر سکتی۔ جو اخلاق کی پابندی سے بے نیاز اور مخاطب میں اطمینانِ حق پیدا کرنے کے بجائے اس کی حرص و ہوا اور خواہش مفاد پرستی کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے انداز اختیار کر کے تحریک اسلامی کی کامیابی شمار نہ ہوگی اور ظاہر ہے اس طور طریقے کو اختیار کرنے کے بعد پھر تحریک اسلامی کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جائے گی۔ دُنیا کی عظیم ترین تحریک اسلامی کو جو خدائی ہدایات دی گئی تھیں اور جن ہدایات کی پابند ہر وہ اسلامی تحریک ہے جو

قیامت تک دنیا میں نمودار ہو ان کی روشنی میں تو کافروں تک کو وقت کا نبی، اے میری قوم، اے قوم کے اکابر، کہہ کر خطاب کرتا ہے اور اسے واضح ہدایت ہے کہ:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

"اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو"

ظاہر ہے کہ تحریک اسلامی جس اسلامی دعوت کی علمبردار ہے اس دعوت کو فریضہ قرار دینے والے مالک الملک نے اس دعوت کو پیش کرنے کا طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے اور اس مخصوص طریقے کے سبب اسلامی تحریک دوسری جماعتوں سے ممتاز اور نمایاں قرار پاتی ہے یہ طریقہ چھوڑ دیا جائے تو پھر دین دار قسم کے لوگوں کا ایک جُھنجھلایا ہوا گروہ تو باقی رہ جاتا ہے جو غم و غصہ سے بھرا ہوا جو کلمہ منہ میں آتا ہے کہے جاتا ہے لیکن وہ اپنے مزاج اور طریقہ کار کے لحاظ سے تحریکِ اسلامی نہیں رہ جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ تو دعوت اسلامی کو ٹبہ لگانے کے مترادف ہے خدا کے ہاں اپنی کہی ہوئی ایک ایک بات کی جواب دہی سے بے خوف مقررین کے گروہ کو اسلامی تحریک کے کارکن کہنا مشکل ہے ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو دعوتِ اسلامی کہنا دشوار ہے اور ان کے لائے ہوئے نظام کو اسلامی نظام سمجھ کر اس سے فلاحِ انسانیت کی اُمیدیں وابستہ کرنا بھی خیالِ خام ہے۔

دعوتِ اسلامی صبر کا طویل راستہ

درحقیقت اسلامی دعوت کا راستہ صبر آزما اور طویل ہے اور جسے عجلت ہو اور اس کے لئے صبر مشکل ہو اسے یہ راستہ راس نہیں آتا ہے۔ ہر راستے کے لئے زادِ راہ ہوتا ہے اور اسلام کے راستے کا زادِ راہ ہی صبر اور توکّل علی اللہ ہے حسن البنّا

شہیدؒ نے اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتے ہوئے کیا خوب بات کہی تھی۔

"آپ کا راستہ ایک متعیّن راستہ ہے۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ یہ منزل تک پہنچنے کا سب سے زیادہ محفوظ راستہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح آپ کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت بھی نہیں ہے مردانگی تو صبر، کوشش اور مسلسل اور خاموش کام میں ہے جو کوئی پکنے سے پہلے ہی پھل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے وہ وقت سے پہلے ہی پھل توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس جلد بازی کے حق میں نہیں ہوں۔ جس کو جلدی ہو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اس صبر آزما دعوت کو چھوڑ کر دوسری جماعتوں کا رُخ کرے جہاں اس کے جذبۂ عجلت پسندی کی تسکین کا سامان ہو سکتا ہے جو ہمارے ساتھ صبر سے کام لیتا ہے اس کا اجر اس کے اللہ کے پاس ہے جو ضائع ہونے والا نہیں ہے پھر یا تو کامیابی و کامرانی قدم چُومے گی یا ہم مرتبہ شہادت وسعادت سے بہرہ مند ہوں گے۔"

دعوت کے اس سارے کام میں جو بات کسی لحظہ فراموش نہیں کی جا سکتی وہ یہ ہے کہ ہم کس کا کام کر رہے ہیں اور جس کا کام کر رہے ہیں وہ ہمارے اس کام سے باخبر ہے یا بے خبر ہے اور باخبر ہے تو وہ غالب، ملکوں کا مالک اجر دینے پر قادر ہے یا نہیں ہے اگر غالب وہی ہے تو پھر وہ جب چاہے گا کامیابی کا راستہ کھول دے گا۔ مزدور کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کا کام اپنی مزدوری کی ضمانت کے ساتھ برابر کرتا رہے اور ظاہر ہے کہ مالک الملک کا کام کرنے والوں کے لئے مزدوری کی ضمانت موجود ہے۔

صبر کے اس طویل راستے کی طرف خود حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی رہنمائی فرمائی۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مکہ کے پُر صعوبت ماحول میں کئی برس سے دعوت اسلامی پیش فرما رہے ہیں اور ہر طرف سے انکار و تکرار پر اصرار ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم دیوارِ کعبہ سے ٹیک لگاتے تشریف فرما ہیں۔ اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جانثار ساتھی جن کے مصائب زبان زدِ عام ہیں تشریف لاتے ہیں اور اسلامی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے ایک مشہور و معروف سوال کرتے ہیں وہ زخموں سے چُور گریبان چاک، تشدّد کا نشانہ مجسّم سوالیہ نشان بنے ہوئے کھڑے ہیں"۔ حضور اسلامی نظام کب آئے گا مصیبت کے یہ دن کب کٹیں گے؟"

یہ سوال سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے جیسے حضورؐ کو اپنے جاں نثار ساتھی کا یہ کلمہ ناگوار گزرا ہے۔ حضورؐ دیوارِ کعبہ کی ٹیک چھوڑ کر فوراً بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں:

"ارت کے بیٹے خباب، ابھی سے گھبرا گئے تم سے پہلے جن لوگوں نے یہ کام کیا ان میں سے بعض کو تو لوگوں نے گڑھے کھود کر زمین میں گاڑ دیا اور پھر آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا اور بعض کو گاڑ کر لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت اور ہڈیاں الگ کر دئے گئے اور تم ابھی سے گھبرا گئے ہو

اور پھر وقفہ کے بعد فرمایا:

"ایک وقت آئے گا جب اللہ کا دین سربلند ہوگا اور ایک معمولی عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سونا اُچھالتی چلی جائے گی۔ لیکن تم تو بے صبری کرتے ہو"۔

راہِ حق کا زادِ راہ صبر و حکمت

صبر ــ مسلسل کام، آزمائش میں ثابت قدمی۔ مخالفتوں کے مقابلے میں شرافت۔ گالیوں کے بدلے میں دُعائیں۔ اللہ کے دین کی اس راہ میں پہلے بھی یہ زادِ راہ لے کر ہر مسافر چلتا رہا ہے تاریخ کے ہر دور میں جس کسی نے دعوتِ اسلامی کو اپنی منزل بنایا اور رضائے الٰہی کو اپنا مقصودِ زندگی ٹھہرایا۔ اس کا یہی

طرزِ عمل رہا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے ترمذی نے روایت کی ہے کہ :

"نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ آزمائش جتنی سخت ہوگی اتنا ہی بڑا انعام ملے گا بشرطیکہ آدمی مصیبت سے گھبرا کر راہِ حق سے بھاگ نہ کھڑا ہو اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبّت کرتا ہے تو اس کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لئے آزمائشوں میں ڈالتا ہے پس جو لوگ اللہ کے فیصلہ پر راضی رہیں اور صبر کریں تو اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں اللہ سے ناراض ہوں تو اللہ بھی ان سے ناراض ہوجاتا ہے"

اس راستے میں تو بدی کو نیکی سے رفع کرنے کی تلقین کی گئی ہے فرمایا :

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (حٰم السجدہ : ۳۴)

"نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو"

صبر و حکمت اسلامی تحریک کا بنیادی طرزِ عمل ہے تحریک کا دورِ تیاری سخت آزمائشوں سے بھرپور ہوتا ہے اور اس دور میں تحریک کے ہر رکن کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ ہر مصیبت کے مقابلے میں صبر سے کام لے اور مستقل مزاجی سے اپنے طریقہ پر قائم رہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ایک ساتھی سے خود فرمایا کہ اسلام کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع بات یہ ہے کہ :

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مشکوٰۃ)

"آمنت باللہ کہو اور پھر اس پر جم جاؤ"

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اسلامی تحریک کا مکّی دور اس کی بہترین مثال ہے وہ بڑے بڑے جوان مردانِ اسلام جنہوں نے بعد میں روم اور ایران کو فتح کیا اور قلعہ خیبر کے دروازے کو اپنی قوت بازو سے اکھاڑ دیا جنہوں نے بدر کے

اندر کفار کے پہلوانوں کو لکڑی اور کھیرے کی طرح کاٹ کر رکھ دیا وہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹے مارے اور لہو لہان کئے گئے لیکن صبر کی مہر اُن کے لبوں پر اور استقامت کی قوت ان کے قدموں میں قائم رہی اس لئے کہ انہیں ابھی راست اقدام کا حکم نہ ملا تھا اور نہ ابھی تحریک بزن کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ ابھی تو سونے کو تپا تپا کر کُندن کیا جا رہا تھا۔ ابھی تصادم کے لئے متوازن اور متناسب قوت جمع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ انہی دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ساتھی کو گزشتہ دور کے ایک نبی کا قصہ سُنایا جس قصے میں خود حضورؐ کی اپنی تمثیل موجود تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دعوت دینے کے جُرم میں ایک نبی کو اتنا مارا گیا کہ لہو لہان کر دیا اور نبی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے اور یہ کہتے جاتے تھے اے اللہ میری قوم کے اس جُرم کو معاف کر دے یہ ناواقف لوگ اصل حقیقت کو نہیں جانتے۔"

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ مکہ سے مدینہ کی نقل مکانی نے اس عظیم اسلامی تحریک کے سامنے دَورِ ضعف اور دَورِ قوت یا دوسرے الفاظ میں عدمِ مزاحمت اور مزاحمت یا قوت کے عدمِ استعمال اور استعمالِ قوت کے فرق کو پوری طرح نمایاں کر دیا اور مدینے کی نقل مکانی راست اقدام کے لئے واضح علامت بن کر سامنے آگئی۔ لیکن جب ایسی کوئی واضح علامت کسی تحریک کے سامنے موجود نہ ہو تو اسے راست اقدام کرنے کے لئے ہزار بار سوچنا لازم ہے اس لئے کہ تحریک اسلامی کوئی کھلونا نہیں ہوتی جسے بچے کی طرح جب چاہے ٹکڑے کر کے توڑ پھوڑ دیا جاتے اور جب دل چاہے بنا لیا جاتے یہ ایک ایسی امانت ہے جو صدیوں کے بعد کسی مخلص مسلم گروہ کے حوالے ہوتی ہے۔

تحریک کے ساتھ چلتے ہوئے خدا کی راہ میں صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے خود خالق کائنات نے فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (البقرہ : ۲۱۴)

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں۔ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے"

ہمارے دور کی تحریک اسلامی کے عظیم رہنما سید مودودیؒ نے ۱۹۶۳ء میں ایک جابر حکومت کے جبر و تشدد کی چلتی ہوئی گولیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا:

"میرے عزیز ساتھیو! اللہ کے دین کے لئے جس کو کام کرنا ہو اس میں دو صفتیں ضرور ہونی چاہئیں ایک صبر دوسرے حکمت۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رُکاوٹ بھی ڈالی جائے اس پر نہ تو مشتعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو بیٹھیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد کے بجائے رُکاوٹ ڈالنے والے کا مقصد پورا کریں۔ بلکہ ہر رُکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جُوں کا توُں قائم رہنا چاہیئے اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جو حکمت کے مطابق ہو"

پھر آگے چل کر حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں۔ بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بر وقت نکال لیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پا کر

بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر بے صبر بھی ہو تو پھر یا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا راہ روی سے ہی باز آجاتا ہے مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے۔"

پھر بند راستوں کے مقابلے میں کام کے دوسرے راستوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے لئے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی دعوت پھیلانے کی بس یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ہم جلسوں میں تقریریں کریں اور ہزاروں آدمی انہیں سنیں۔ یہ تو کام کی ایک صورت ہے آپ تین تین چار چار آدمیوں کے وفود کی شکل اختیار کر کے علاقے میں پھیل جائیں۔ گھر گھر اور دکان دکان اور مسجد مسجد جائیے، فرداً فرداً لوگوں سے ملئے ایک ایک شخص کو بتائیے کہ تحریک اسلامی کیا ہے اس کا نظام کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کا طریق کار کیا ہے وہ کن چیزوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے اور کن بھلائیوں کو قائم کرنا چاہتی ہے جو لوگ بحث میں اُلجھنے کی کوشش کریں اُن سے اُلجھے بغیر گزر جائیے آپ کا طریقہ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کی ربانی ہدایت کے مطابق ہونا چاہیے آپ کی زبان شیریں ہو آپ کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ آپ کا برتاؤ شریفانہ ہو۔ آپ برائی کا جواب بھی بھلائی سے دیں اور اپنی زبان ہی سے نہیں اپنے رویئے سے بھی یہ ثابت کر دیں کہ آپ فی الواقع بدی کی جگہ نیکی قائم کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد یقین رکھیئے کہ اللہ کی رحمت آپ کے ساتھ ہوگی اور جتنا کام آپ کریں گے اس سے زیادہ کام اللہ کے فرشتے آپ کے ساتھ مل کر کریں گے۔"

اب آپ دورِ نبوت کی اسلامی تحریک میں سے حکمت کی مثال لیجئے یہ مثال

صُلحِ حُدیبیہ کی ہے۔ کفّار مزاحمت پر آمادہ ہیں۔ مسلمانوں کی نفری اپنی تعداد، حالات، محل وقوع اور قوت کے لحاظ سے ناکافی ہے اور تبلیغ دین کے لئے نئے نئے راستے نکالنے کی ضرورت ہے۔ قائد تحریک کفار کی مزاحمت پر طرح دے جاتے ہیں۔ بعض شرائط صلح کی بظاہر مسلمانوں کو ناپسند ہیں اور کمزوری کا نشان نظر آتی ہیں۔ لیکن قائد تحریک آئندہ کے وسیع تر تبلیغی امکانات پیدا کرنے کے لئے صُلح اور مصالحت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قرآن صلح و مصالحت کی اس کاروائی کو فتحِ مبین قرار دیتا ہے اور واقعی وہ فتح مبین ہی بن کر رہتی ہے۔ تحریک کو ایک بڑے دشمن کے ساتھ مستقل تصادم سے چند دنوں کے لئے نجات مل جاتی ہے جس سے فائدہ اُٹھا کر متعدد چھوٹی بڑی فتوحات، قبائل سے معاہدات اور تبلیغ کے ذریعہ تحریک کے لئے کامیابی کے بے شمار دوسرے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ جوش و جذبہ اور حکمت کار کا باہمی تعلق متوازن اور معقول ہو تو تحریک کا کام بڑھتا ہے۔ جوش و جذبہ نہ ہو صرف حکمت ہو تو راستہ طویل اور سفر بوجھل ہوجاتا ہے، صرف جوش و جذبہ ہو اور حکمت نہ ہو تو تحریک راستے میں آنے والی کسی بھی چٹان سے سر پھوڑ کر ختم ہوجاتی یا میلوں دُور پیچھے چلی جاتی ہے۔ جوش و جذبہ کی مثال پٹرول کی سی ہے۔ پٹرول کے ڈرم کو بیک وقت آگ لگا لیجئے تو وہ تباہی کا سامان ثابت ہوگا اور گاڑی کے انجن میں ڈال کر تھوڑا تھوڑا کنٹرول کے ساتھ استعمال کیجیے تو طویل منزلیں بھی مختصر ہوتی چلی جائیں گی۔

غرض دعوت دین میں حکمتِ تبلیغ ایک بنیادی ضرورت ہے جو اسلامی تحریک کے ہر کارکن کے لئے جاننا ضروری ہے اگر کارکن حکمت تبلیغ سے محروم ہوں تو دعوت دین کا کام ممکن نہیں رہ جاتا۔

اسلام ایک تحریک

اسلام[1] دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے یہ تحریک قدیم ترین زمانے سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رُسُل اللہ (اللہ کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ ان ہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لئے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

واحد راستہ۔ اُسوہ حسنہ

جب ہم انبیاء علیہم السّلام کے نقشِ قدم کا سُراغ لگانے کے لئے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقّت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہد جدید (NEW TESTAMENT) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال ملتے ہیں، جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کیسے ماحول سے اسے

---

[1] اسلامی ریاست صفحہ ۶۹۸

سابقہ پیش آتا ہے لیکن بعد کے مسائل حضرت مسیح علیہ السلام کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لئے ہم اسی طرف رُجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں صرف ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آغاز کار، دعوت توحید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع بھی ہو رہا تھا اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے خود آپؐ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ بحرین سے یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خوری کے جال میں پھانس رکھا تھا مشرقی

ساحل کے عین مقابل افریقہ میں حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہبوں اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے، اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اہم ترین مسئلہ توحید

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے آپ کو معلوم ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطہ نظر سے انسان کی اخلاقی تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھنا بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے خواہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی، ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع ایک

بادشاہ موجود ہے اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی ہے اور نہ تو اس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے آگے سر جھکائے اور مطیع بندہ بن کر رہے۔ دوسری طرف اس واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھایا جائے کہ پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے اس لئے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے میجسٹی اسی ایک کے لئے مختص ہے یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے ہولی نس ساری کی ساری اسی کے لئے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے ہائی نس صرف اسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار اور سزاوار ہے یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ مہاراجہ، کوئی ولی یا کارساز کوئی دعائیں سننے والا اور فریادرس نہیں ہے کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے کہ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں اور مولیٰ صرف ایک ہی ہے لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھیڑ کر از سرِ نو ایک نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

بجز توحید ہر مسئلے سے صرف نظر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کاروائی کے براہ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لئے جائیں پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا اعلان کر دیا اس سے کم کسی چیز پر اس کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ پیغمبرانہ جرآت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام میں نہیں آسکتے۔ اس کام میں وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں۔ جو آپ کی طرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی آواز سُن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لئے کشش ہو۔ اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لئے اُٹھیں لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لئے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید۔ تصوّر حیات

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا

ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پُورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے آج دُنیا آپ کے مؤذنوں کو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی صدا بلند کرتے ہوتے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سُننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جاتے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے، کوئی قانون مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدّس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لئے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

توحیدی کشمکش

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی پُکارنے والے نے جان کر پُکارا تھا اور سُننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے اس لئے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا پُجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا،

نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا اس لئے الکفر ملۃ واحدۃ کے بمصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک سے لڑنے کے لئے ایک ہوگئے اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر راستی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لئے تیار ہو جائیں ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لئے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو، دو، چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست آشنا سب چھوٹ گئے، کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی، کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت وریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ ان کا آنا ضروری تھا۔ ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

آزمائش برائے تربیتِ کردار

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی نہ سکتے تھے جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا۔ جس کی دراصل ضرورت تھی، کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لئے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا بلکہ صرف حق اور صداقت کے لئے، خدا اور اس کی رضا کے لئے۔ اسی کے لئے وہ پٹے، اسی کے لئے بھوکے مرے، اسی کے لئے دُنیا بھر کی جفا کاریوں کا تختۂ مشق بنے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لئے اُٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدّوجہد، مصیبت، تکلیف پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لئے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دُور ہو جائے اپنے نصبُ العین پر ان کی نگاہ جمی رہے۔ جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں۔ جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ہونا، اس کا مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونا، اس کا قاهِرٌ فَوْقَ عِبَادِهٖ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک ان کے دلوں میں نہ آنے پائے۔

ابتلاء حق شناسی کا ذریعہ

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پٹتے جا رہے ہیں۔ قید کئے جا رہے ہیں۔ گھروں سے نکالے جا رہے

ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ کس لئے ؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لئے بھی نہیں ہے کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لئے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں۔ آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لئے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں ؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دُنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان مال، اولاد ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھُل جاتی تھیں۔ ان کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبّر یا اجداد پرستی کی جہالت یا اغراض دُنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اس طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لئے یہ تحریک اُٹھی تھی، پُورا پُورا مظاہرہ کیا ان کی ہر بات ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی رُوح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

قائدِ تحریک کا ایثار

ان کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار کہلاتا تھا۔ اس کی سواری کے لئے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لئے اُٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

تصوّرِ مساوات

قریش کے عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس معاذاللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں، ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں مگر وہ شخص جو انسانوں کی اُونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا۔ اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو

دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

فلاحِ انسانیت کی پکار

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپؐ فی الحقیقت انسان کی فلاح کے لئے اُٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لئے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالو تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپؐ عربوں کی برتری کے لئے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپؐ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مسلکِ دیانتداری

مکہ سے جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپؐ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لے کر چل دیتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی کوشش کی اور اس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد

میدانِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف لڑنے کھڑے ہوتے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت داری کو نہیں بھولتا؟ اس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے بھنچ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفّار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

اسلامی طرزِ حیات کا مظاہرہ

تیرہ برس کی شدید جدّوجہد کے بعد وقت آیا جب یہ نوبت آئی کہ اسلام مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسٹیٹ قائم کرے۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے کارکن فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی کام کرنے کا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ وہ قائم کر دی گئی، دس برس تک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدّت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پہ چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرّد تخیّل سے ترقی کر کے ایک مکمّل نظامِ تمدّن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کے انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لئے اصول بنے ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا۔ اس خاص طرز پہ کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کئے گئے اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدّت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کی اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ جوں جوں لوگ اسلام

کو اس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خودبخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے خالدؓ بن ولید قائل ہوتے ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ قائل ہوتے۔ ابوسفیانؓ قائل ہوتے قاتل حمزہ وحشیؓ قائل ہوتے ہندِ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غیرخونی انقلاب

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ پانچ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی۔ طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیرخونی انقلاب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ زندگی کا طرز بدل گیا۔ اخلاق کی دُنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے۔ غرض ایک پُوری قوم کی کایا پلٹ ہو کر رہ گئی۔

نظریاتی انسان کی تشکیل

جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اُچکے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل

تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جوڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا تاج شاہی ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اُسے چُھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لئے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریا کاری کا میل نہ آجائے وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیش قرار رقم اس غرض کے لئے پیش کی کہ وہ سرکاری معاملہ میں کچھ کمی کر دے۔ مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصّہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اُٹھا لیں اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے بازاروں میں پیدل پھرتے تھے۔ دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا۔ ان سے انٹرویو لے سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے

غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالارانِ ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ ان کا اقبال خود آ کر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش نہ ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لاتے تھے اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مال غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارے کا سارا سپہ سالار کے سامنے لا کر رکھ دیتے تھے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح بدل ڈالا ہو؟

نظریاتی تبلیغی انقلاب

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے، مگر بعد کے دس سال میں سارا ملک مسلمان

ہو گیا اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے، اس لئے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی اسے محض خیالی آدمی قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کرتا تھا۔ اس وقت صرف غیر معمولی ذہانت اور سمجھ رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت میں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کام کو کرتے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیاناً آ گئے، تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی۔ جس کو بنانے کے لئے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لئے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لئے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

اسلامی نظام کا ایک طبعی واقعہ

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے آج ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لئے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے اس کے لئے جواں ہمت لوگوں کی ضرورت

ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جمادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کردیں، اپنی اُمیدوں کا اور اپنے والدین کی تمنّاؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں سوسائٹی حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہوں اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کرنے سے ہو سکتا ہے۔[1]

---

[1] اسلامی ریاست صفحہ ۶۹۸

طریق تبلیغ

جہاں[1] تک تبلیغِ مسلک کا تعلق ہے عام طور پر مسلمانوں کی جماعتیں تشدّد سے کام لیتی ہیں اور تندیٔ جذبات اور مناظرانہ داؤ پیچ اور تیزیٔ زبان کے مظاہرے سے لوگوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے مسلک کی تبلیغ کے لئے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے اس معاملہ میں بے حد صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے یہ تحریری اور تقریری مناظرے اور بحثیں جو عام طور پر مروّج ہیں ان میں مبلّغ غیر محسوس طور پر غضب النفس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور محسوس تک نہیں کرتا کہ میں خود اپنے محبوب نصب العین کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ رہا ہوں، بخلاف اس کے ہمیں ایک ڈاکٹر کی طرح کام کرنا ہے جو آخر دم تک کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو تندرست ہو جائے اور اگر اسے کاٹ کر جسم سے الگ کرتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ دوسری تمام تدابیر کو آزما چکنے کے بعد اس کی علاج پذیری سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سب سے پہلے بیمار عضو کو کاٹ پھینکنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھیئے کہ یہ عوام کا جو انبوہ آپ کے گرد پھیلا ہوا ہے ان میں سے جو لوگ کفر و شرک یا فسق کے مریض ہیں ان کا علاج غصّہ اور تلخی سے کرنے کے بجائے صبر اور ہمدردی سے کرنا ہے ان بیمار اعضاء کو معًا کاٹ کر نہیں پھینک

---

[1] جماعت اسلامی حصّہ دوم صفحہ ۹-۱۰ تقریر امیر جماعت

دینا ہے بلکہ ان پر تمام دوسری بہتر تدابیر کو آزمالینا ہے۔

عوام کی معذوری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان لوگوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد اور رسوم خود مذہبیت ہی کے مقدس دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصلاح کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس مہم کو صبر و تحمل ہی سے سر کیا جا سکتا ہے، عرب میں بھی یہی حالات تھے اور وہاں بھی ٹھنڈے طریقوں سے تبلیغ کا کام کیا گیا۔

ہماری تبلیغی پالیسی

سب سے پہلے تبلیغی پالیسی کے متعلق یہ سمجھ لیجے۔ کہ ہماری دعوت کا اصول الاقدم فالاقدم ہونا چاہیے جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی تعرض کرنا چاہیئے اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اسی طرح جس چیز کی دینی اہمیت کم ہے اس پر بعد میں توجہ دینی چاہیے اور اس کی قدر و قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جُدا جُدا زور دینے کے بجائے اس اصل الاصول کی فکر کرنی چاہیے جس کی اصلاح سے فروع کی اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے فرض کیجئے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل جل کر گر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روکنے کے لئے الگ الگ تدابیر نہیں اختیار کی جائیں۔ بلکہ براہ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی فکر کی جائے گی یا مثلاً اگر کسی شخص کا خون خراب ہو اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں نمودار ہوں، تو ایک ایک پھوڑے پر نشتر چلانے اور ایک ایک ناسور پر پھایہ رکھنے کی جگہ اصلاح خون کی تدبیر کی جائے گی۔ اس اصول پر ہمارے مبلغین کو مقامی حالات پر غور کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا؟

اور پھر ہر ضرب اسی اصل علت کو دُور کرنے کے لئے لگائی جانی چاہیے اس کام کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیئے یہ جڑ اگر قائم ہوگئی تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے۔

جماعت کا پورا لٹریچر اسی اصول پر لکھا گیا ہے آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی امور کے استحکام کے لئے پورا زور استدلال صرف کیا گیا ہے مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے، شاخوں کی کٹائی چھنٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قصر حیات کے مٹتے ہوئے نقوش زینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں بلکہ اس کی بنیادوں کی فکر کریں۔ ورنہ دیواروں کی خوبصورتی تو ترقی کر جائے گی مگر اس کی تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت کو کھنڈر بنتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے اور پھر ہر نشتر اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے لیکن جزئیات پر حملہ کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی دیواروں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس طرز پر کام کرنے سے خواہ مخواہ جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے چبھنے والے القاب مثلاً وہابی اور بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ سر پھٹنے تک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریق تبلیغ کو دہرانے سے قطعاً اجتناب کیجئے۔

اگر آپ حضرات غور کریں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے یا

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل ص ۷۲ تا ۷۹ تقریر امیر جماعت

عقیدۂ معاد کی ناواقفیت سے۔ علاوہ بریں کچھ خرابیاں ایسی ہیں جو اصول و فروعِ دین کی صحیح ترتیب کو اُلٹ دینے سے نمودار ہوئی ہیں۔ خود بگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں اور وہ ہے کتاب و سُنّت سے بے تعلقی۔ یہ سب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ بکثرت علماء تک کتاب و سُنّت سے براہ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے اب اگر ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہیے۔ جب تک بنیادی معتقدات کی اصلاح نہیں ہو جاتی، لوگوں کی فروعی گمراہیوں کو صبر سے گوارا کرنا پڑے گا میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فروعات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ ہرگز نہ زور دیا جائے۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو شرارت اور خبث کی بنا پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام بیچارے محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوتے ہیں۔ مدت ہائے دراز کی غلط تعلیم و تربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اُتر گئی ہے کہ جن طور طریقوں کو وہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہی کا نام دین ہے۔ ان بیچاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صبر و تحمل سے بتدریج توحید، نبوت اور معاد کے اسلامی تصورات کو ان کے دلوں میں راسخ کیا جائے۔ ان کے عقائد کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف "وہابی وہابی" پکار کر بھیڑ جمع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلاب عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوے کی صداقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے روگردانی کرنے والوں میں بالکل مختصر سا گروہ ایسا تھا جو ذاتی اغراض کی بنا پر مخالفت کر رہا تھا۔ باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے جب تحریک پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آ گیا تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لئے انکار کے راستے مسدود ہو گئے، ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ

اغراض کی بنا پر لڑ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ میدان میں تنہا رہ گئے ہیں اس لئے وہ سر جھکا دینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی دعوت حق کی کامیابی کا راستہ یہی ہے اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عریاں کر دیں تو ان میں سے نیک نیت فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے اپنے کبراء کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملیں گے۔ پھر جو لوگ غرض کی بنا پر سد راہ بنے ہوئے ہیں وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری چلتی ہوئی گاڑی ان کے روکے نہ رک سکے گی۔

یہ پروگرام اگر اختیار کرنا ہو تو پھر "آمین بالجہر" اور "تیجے" اور "قل" کے جھگڑے ختم کیجئے۔ غور تو کیجیے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصب العین بس اتنا ہی کچھ ہے؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ اُن مہمات امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی جن کے لئے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مظالم کا تختہ مشق بنتے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھا دی گئی ہے اقامت دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ فکر تو اس کی کیجیے کہ لوگ خدا کے دین کو برضا و رغبت تسلیم کریں اور سُنّتِ نبویہ کا اتباع کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ چیز پیدا ہو گئی تو پھر جس کو جو چیز کتاب و سُنّت سے ثابت ہوتی نظر آئے گی، وہ اسے اختیار کرے گا اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہ ملے گا اسے ترک کر دے گا۔ زور تو اسی ایک بنیادی اصلاح پر دینا چاہیے۔ اصول سے فروع کی طرف چلنے کی جو تدریج اُسوہ نبوی میں پائی جاتی ہے اگر اسے نظر انداز کر کے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کر دیا جائے گا تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہو گا۔ اُسوۂ نبوی کا اتباع نہ ہو گا۔

دَورِ اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم خرابیاں نہیں تھیں جتنی آج

ہمارے دور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت سب پر چوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا اصلاح کی وادی کو ایک ہی جست میں طے کر ڈالا گیا تھا، نہیں، بلکہ اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئیں پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی۔ پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو دھونے کا سلسلہ بتدریج کئی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار کو خوب سمجھ لیجیے پھر آگے قدم بڑھائیے۔

ایک اور چیز میں نے یہ محسوس کی ہے کہ ہمارے رفقاء میں کام کو مبالغہ سے پیش کرنے کا جذبہ بھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس جذبہ کو ختم کر دیا جائے نہ صرف یہ کہ اپنی کارگزاری بتانے میں مبالغہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ اپنی جگہ اپنے کام کو تسلی بخش بھی نہ سمجھا جائے۔ بہتر سے بہتر طریقہ پر کام کرنے کے بعد بھی مطمئن نہ ہو جائیے اور اس کے اچھے پہلوؤں پر قانع ہونے کے بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو دیکھ دیکھ کر بے چین رہیے جو کام صحیح ہوا ہو اس پر خدا کا شکر بجا لائیے اور جو کمی رہ گئی ہو اسے پورا کرنے کی توفیق بھی اس سے طلب کیجیے پھر مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ دوسری جماعتوں کے لوگوں میں کام کرتے وقت آپ پر مناظرہ کی روح چھا جاتی ہے اور مفاخرہ و مکابرت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بہت اچھا ہے اور اگر درحقیقت یہ شبہ صحیح ہے تو ان بلاؤں سے نجات حاصل کیجیے۔

اس سلسلہ میں اپنے طرزِ عمل اور اپنے اندازِ گفتار سے دوسری جماعتوں پر یہ واضح کر دیجیے کہ ہم کسی سے جماعتی کشمکش نہیں کرنا چاہتے، ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے اور ہمارا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے جو بھی حق سے منحرف ہے۔ ہم بس اس کی غلطی کو صاف بتا دیں گے اس کے بعد ہمارا خاص طور پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہو گا بہرحال کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ آپ اس کے حریف بن کر

اُٹھے ہیں، ہمیں تو صرف نظامِ کفر وجاہلیت کا حریف بن کر رہنا ہے اسی سے مقابلہ کرنا ہے اور اس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہو گی۔ اسی تناسب سے ہماری اس کی دشمنی میں بھی شدت ہو گی۔

بعض اصحاب کی طرف سے پوچھا گیا ہے کہ آیا ہم ان مجلسوں اور ان تقریبات میں شریک ہو کر تقریریں کر سکتے ہیں جو عام انجمنوں کی طرف سے منعقد ہوا کرتی ہیں؟ اس میں شک نہیں ہمیں اس ذریعہ سے اپنے خیالات کو پھیلانے کے مواقع ملتے ہیں مگر میرا مشاہدہ ہے کہ یہ طریق کار مفید نہیں ہے ایک اسٹیج پر جب قسم قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور انہی کے دوران ہماری دعوت بھی پیش کی جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ان بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ہمیں خوش کرنے کے لئے سنائی جاتی ہیں، یہ جلسہ ایک دماغی دستر خوان ہے جس پر جہاں اور طرح طرح کے مربّے اور اچار رکھے ہیں وہاں ایک نئی قسم کا یہ اچار بھی رکھ دیا گیا ہے انجمن بازی کے نقّار خانہ میں اگر بالفرض آپ نے بوجہِ احسن اپنا پیغام پیش بھی کر دیا تب بھی نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ لوگ داد دیتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ فلاں صاحب خوب بولے۔ ہماری قوم کا حال آج کل اس بگڑے ہوئے رئیس کا سا ہو گیا ہے جس کے گرد و پیش بہت سے خوشامدی مصاحب لگے ہوئے ہوں اور اسے خوش کرنے میں منہمک ہوں ان خوشامدیوں کے زمرے میں شامل ہو کر آپ حکمتِ دین اور حقائق زندگی کو خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کریں۔ بہر حال یہ رئیس المزاج قوم آپ کی باتیں انہی کانوں سے سُنے گی جس سے وہ دوسرے مصاحبوں کی باتیں سنتی ہے۔ ان وجوہ سے میں جماعت کے مقررین کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے انفرادیت یا دوسرے لفظوں میں اپنی امتیازی حیثیت کو خوب مستحکم کر لیجئے اور بالکل جُداگانہ طور پر اپنے نظریات پیش کرتے رہیے۔ البتہ اگر یہ ممکن ہو کہ مارکیٹ میں جو خوش تقریر ریکارڈ خوب مقبول ہیں، ان کے اندر آپ اپنا نغمہ بھر لیں تو یہ صورت مفید ثابت ہو گی، مختلف لیڈروں اور مقرروں پر

اپنا اثر اس حد تک پھیلا دیجیے کہ ان کی تقریروں میں خواہ مخواہ آپ ہی کے خیالات آنے لگیں، جب وہ کچھ عرصہ تک محض قولاً ہمارے نظریات کو بیان کرتے رہیں گے تو بعید نہیں کہ ایک روز انہیں اپنے ضمیر کی آواز اور رائے عام کے دباؤ سے اپنی عملی روش کو بھی بدلنا پڑے۔ یہ اسکیم اگر خوب وسعت کے ساتھ عمل میں لائی جائے تو آخر کار اُجرت پر تقریر کرنے والے مقررین جنہوں نے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رکھا ہے اسٹیج سے ہٹا دیے جائیں گے اور کام کے آدمیوں کو پبلک خود سامنے لے آئے گی۔

ناقص علم و عمل کا فتنہ

مبلّغ دین کے لئے لازم ہے کہ مبلّغ مریض کا نام لئے بغیر اس کے مرض کے بُرے انجام کا تمثیل کے پیرائے میں ذکر کرے، قرآن میں ایسے شخص کی مثال پیش کی گئی ہے جو آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا یعنی حقیقت سے واقف تھا، اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا وہ طرزِ عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے، اسی عمل کے مطابق علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا لیکن وہ دُنیا کے فائدوں، لذّتوں اور آسائشوں کی طرف جُھک پڑا، خواہشات نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے ان کے آگے سپر ڈال دی، مالی امور کی طلب میں دنیا کی حرص و طمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص و طمع سے ایسا مغلوب ہوا کہ اپنے سب اونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا، اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر سے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف اسے لے جاتا رہا، یہاں تک کہ ظالم نے اسے ان لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ ہوش گم کر چکے تھے:

اُتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ

(اعراف: ۱۷۵، ۱۷۶)

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا، مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے پابندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا۔ اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو "کُتّے" سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتش حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو دنیا کا "کتّا" کہتے ہیں۔ "کتے" کی جبلّت کیا ہے؟ حرص و آز، چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بُوئے طعام آجائے اسے پتھر مار دیئے تب بھی اس کی یہ توقع دُور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو اسے پھینکی گئی ہے کوئی ہڈّی ہو یا روٹی کا کوئی ٹکڑا، پیٹ کا بندہ بس ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے اس سے بے التفاتی کیجیے تب بھی لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لئے زبان لٹکائے ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو بس وہ پیٹ کی نگاہ سے دیکھتا ہے، کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو، جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو بھی اس میں سے صرف اپنا حصّہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لئے

مخصوص رکھنا چاہے گا۔ اور کسی دوسرے کتّے کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دے گا اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ شہوتِ فرج ہے اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے، اور اسی کو سونگھنے اور چاٹنے میں مشغول رہتا ہے، پس تشبیہ کا مدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتّے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ (الاعراف : ۱۷۶)

"لہٰذا اس کی حالت کتّے کی سی ہوگئی کہ تم اس پہ حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔"

ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○ (الاعراف : ۱۷۶)

"ایسی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید کہ یہ غور و فکر کریں۔"

بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے

دعوتِ دین میں بُرائی کے مقابلہ میں بھلائی سے جواب دینے کی ہدایت کی گئی ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ○ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ○ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ○

(المومنون: ۹۶-۹۷)

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو، جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں، اور دعا کرو کہ "پرور دگار" میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں"

بدکلامی کا مقابلہ خوش کلامی سے

سورہ انعام (۱۰۸) میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۰۸)

"اے ایمان والو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں"

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ وہ تبلیغ کے جوش میں اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے۔ کیونکہ یہ چیز ان کو حق کے قریب لانے کے بجائے دُور پھینک دے گی۔

اسی لئے سورۂ آل عمران کی آیت ۹۷ - ۹۸ میں شیطان کی اکساہٹ سے اپنے رب کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ فریق مخالف کی بدکلامی اور درشتی سے کبھی رد عمل کے طور پر آدمی مشتعل ہو کر گالم گلوچ پر بھی اُتر آتا ہے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔

بدی کا نیکی سے ازالہ

سورہ حٰمٓ السجدہ آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَۃٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۭ (حٰمٓ السجدہ: ۳۴)

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔"

اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لئے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہئیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے واسطے سے آپؐ کے پیروؤں کو یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ دعوت حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا۔ جس میں اخلاق، انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ دی گئیں تھیں۔ ہر جھوٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لئے استعمال کئے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپؐ پر چسپاں کئے جا رہے تھے۔ اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپؐ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں جن سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لئے پروگرام یہ بنایا گیا تھا، کہ ہلڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپؐ کی تاک میں لگا رہے اور جب آپؐ دعوت حق کے لئے زبان کھولیں تو انتہائی شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپؐ کی بات نہ سن سکے۔

یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے، اس وقت مخالفتوں کو توڑنے کے لئے یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

قرآن کی اس تفہیم پر پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اٹھالائے ہوں جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہے لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا بھٹہ بٹھادیتی ہے، کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اس کی فطرت بدی سے نفرت کئے بغیر نہیں رہ سکتی، بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لئے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں، یہ چیز دوسروں کے دلوں میں ان کا وقار پیدا کرنا تو درکنار انہیں خود اپنی نظروں سے گرادیتی ہے اور ان کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم وہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے، اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آکر رہتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروف پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہوجائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدّت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفّر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہوجائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں، بلکہ اس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجہ کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کردو تو یہ محض نیکی ہے، اعلیٰ درجہ کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے، گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی مگر گالی دینے والے کی زبان نہ بند کر سکے گی۔ لیکن آپ گالی کے جواب میں دُعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بد کلامی کے لئے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا ہو اور اس کی زیادتیاں آپ برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو تو آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آرہے گا۔ کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے، تاہم اس قاعدہ کلیہ کو اسی معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجہ کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے خبیث النفس بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عقرب کا زہریلا پن ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا، لیکن اس طرح کے شرِ مجسّم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسّم انسان کمیاب ہیں۔

تبلیغ اور صبر لازم و ملزوم

مبلغ کے لئے بدی کے بدلے نیکی کرنے کے مقام کا حصول ایک عظیم کام ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَا إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ (السجدہ[1])

---

[1] تفہیم القرآن

"یہ صفت نصیب نہیں ہوتی، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں"

یعنی بدی کو نیکی سے دفع کرنے کا نسخہ ہے تو بڑا کارگر مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اس کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔ اس کے لئے بڑا دل، بڑا حوصلہ، بڑی قوت برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے، وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک ان باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاندجانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں ان کی بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے، یہ کام وہی آدمی کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقام بلند سے نیچے اتارنے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ (السجدہ: ۳۵)

"اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں"

یہ قانون فطرت ہے اور بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی، یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ گھٹیا درجے کے مخالفین اپنی کمینی چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں اور دیگر حرکتوں سے اس کو شکست دے سکیں۔

؎ تفہیم القرآن

نزغ شیطانی سے پناہ کا اہتمام

فرمایا گیا:

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ

"اور اگر تم شیطان کی طرف سے اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔"

شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جارہا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لڑنے والوں کو خصوصاً ان کے ذمہ دار لوگوں اور سب سے بڑھ کر ان کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کرادے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب بُرائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جارہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی بہت اونچے درجے کے انسان نہیں ہیں۔ فلاں گھٹیا حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے، عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں، وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالف ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راست بازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اس وقت وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے بے جا حرکت یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی کوئی ایک حرکت ہی سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو ان کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب

لہ تفہیم القرآن

ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے، اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنا رہو، وہ بڑا دردمند و خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اس حملے کے جواب میں تو اٹھ جانا چاہیے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ، کہ یہ شیطان کی اکساہٹ ہے، جو غصہ دلا کر تم سے غلطی کرانا چاہتا ہے اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہو گا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مسکراتے رہے، آخر کار جناب صدیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی، ان کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا، اور آپؐ فوراً اُٹھ کر تشریف لے گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اُٹھ کر آپؐ کے پیچھے ہو لیے، اور راستے میں عرض کیا کہ کیا ماجرہ ہے وہ گالیاں دیتا رہا اور آپؐ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپؐ ناراض ہو گئے؟۔ فرمایا "جب تک تم خاموش تھے ایک فرشتہ تمہارے

ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آگیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

غرض مخالفتوں کے طوفان کے درمیان یہ بات ذہن میں راسخ رہے کہ اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (السجدہ : ۳۶)

"وہ سب کچھ جانتا ہے۔"

مخالفتوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سکون اور اطمینان کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔ چونکہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے، ہماری اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سُن رہا ہے اور دونوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے اسی اعتماد میں ایک بندۂ مومن دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے خود پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

حکمتِ تبلیغ کے چار نکات

قرآن نے تبلیغ کی حکمت کے چار نکات بیان کئے ہیں۔ (۱) نرمی اور درگزر کا طریقہ۔ (۲) نیکی کی تلقین مسلسل۔ (۳) جُہلا کے ساتھ اُلجھنے سے پرہیز۔ (۴) اکساہٹ پر خدا کی پناہ طلب کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝
وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ

ے تفہیم القرآن

اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝ (اعراف: ۱۹۹، ۲۰۰)

"اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

پھر مبلغ کے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ۝ وَ اِخۡوَانُہُمۡ یَمُدُّوۡنَہُمۡ فِی الۡغَیِّ ثُمَّ لَا یُقۡصِرُوۡنَ ۝ (اعراف: ۲۰۱، ۲۰۲)

"حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریقہ کیا ہے، رہے شیاطین کے بھائی بند تو وہ انہیں کج روی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔"

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضورؐ کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اٹھیں، ان نکات کو اب سلسلہ وار دیکھئے یہ وہ صفات ہیں جو داعی میں ہونا نہایت ضروری ہیں۔

تحمل، بردباری اور اعلیٰ ظرفی

داعیٔ حق کے لئے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل مزاج اور اعلیٰ ظرف ہونا چاہیے، اس کو اپنے

ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ النّاس کے لئے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لئے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی، اسے شدید سے شدید سے اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اس کام کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے، اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو میرے حق سے محروم کرے میں اس کا حق دوں جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔" اور اسی چیز کی ہدایت آپؐ ان لوگوں کو کرتے تھے جنہیں آپؐ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ:

بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا

"یعنی جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لئے مژدۂ جانفزا ہو نہ کہ باعثِ نفرت، اور لوگوں کے لئے تم سہولت کے موجب بنو، نہ کہ تنگی و سختی کے۔"

اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔

"یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم خو ہو، اگر تم درشت خو ہوتے اور سنگدل تو یہ سب لوگ تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔"

فلسفہ طرازی کے بجائے راست گوئی

دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں۔ یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقل عام (COMMON SENSE) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔

اس طرح داعیٔ حق کی اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے، ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں، وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں، کیونکہ عام انسان خواہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفینِ حق سے پھرتے اور داعیٔ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظام باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی، اور پھر آپؐ کے بعد تھوڑی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں سو فیصد اور کہیں ۸۰ فیصد اور ۹۰ فیصد باشندے مسلمان ہو گئے۔

جاہلوں سے اجتناب

اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے، وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے خواہ وہ اُلجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں، داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے، کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لئے تیار ہوں، اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع کرے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے، اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

اشتعال میں صبر کا اہتمام

مخالفین کی شدت اور شرارتوں پر اگر اشتعال پیدا ہو تو اسے شیطانی وسوسہ سمجھیں چنانچہ جب کبھی داعی حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوت حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے، دعوت حق کا کام ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر ہوکر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب صحیح سمجھ کر اٹھایا جائے، لیکن شیطان جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا

رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیٔ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیٔ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے، یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُر فریب تاویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں لپیٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس کی تہہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی، اسی لئے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں، وہ تو اپنے نفس میں کسی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آجاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے، رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوتی ہے اور اس سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہوتا ہے یا تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے، اور ان سے مغلوب ہو کر غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں اور پھر جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انہیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رکتے مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

دعوت میں استقامت

داعیٔ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ وقتی تقاضوں کے پیچھے لگ کر دعوت حق کو کسی حال میں ترک نہ کرے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ مِنْ رَّبِّىْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۳)

لہ تفہیم القرآن

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تم ان لوگوں کے سامنے نشانی (یعنی معجزہ)
پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کیوں نہ کوئی نشانی انتخاب کر لی؟
ان سے کہو" میں تو صرف اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے
میری طرف بھیجی ہے، یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے
اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے قبول کریں"

آیت کے ابتدائی حصہ میں کفار کے جس سوال کا ذکر ہے اس میں صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لئے بنا لائے ہوتے، اس کے جواب میں آپؐ کا جواب کس شان کا ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس چیز کی میں خود ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کروں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں، معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے، اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں، ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف ہویدا ہونے لگتے ہیں۔

حکمتِ تبلیغ اور حُسنِ خلق

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ (الاعراف: ۲۰۴)

"جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور
خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے"

یعنی یہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی

کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور وغل برپا کرتے ہو تاکہ نہ خود سُنو اور نہ کوئی دوسرا اسُن سکے، اس روش کو چھوڑ دو اور غور سے سُنو تو کہ اس میں تعلیم کیا دی گئی ہے کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اسی رحمت کے حصہ دار بن جاؤ، جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف وشیریں اور سیاہ دلوں کو مسخر کرنے والا انداز تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی جو شخص حکمت تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں بڑا سبق پا سکتا ہے۔

ذکر خدا کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرماتا ہے:

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ○ (اعراف: ۲۰۵)

"اے نبیؐ اپنے رب کو صبح وشام یاد کیا کرو، دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ، اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ، تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوتے ہیں"

یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی، خواہ وہ زبان سے ہو یا خیال سے، صبح وشام سے مراد یہی دو وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ کی یاد سے مقصود نماز ہے، اور صبح وشام کا لفظ دائماً کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہنا ہے، یہ آخری نصیحت ہے جو خطبہ کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارا حال کہیں غافلوں کا سا نہ ہو جائے، دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق واعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ

انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اس کو آزمائش کے لئے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا، پس جو شخص راہ راست پر چلنا اور دنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہو اس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں خود اس کو لاحق نہ ہو جائے اسی لیے نماز اور ذکر الٰہی اور دائمی تعلق الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

حکمت اور عمدہ نصیحت

اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

"اے نبی اپنے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھادھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے، ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت سے ہی ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت

لہ تفہیم القرآن

میں بُرائی سے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی اُبھارا جائے، اور ان کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو، مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے، اور اپنی بلندی کے احساس سے لذّت لے رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے،

طریق بحث کی عمدگی اور خوبی

دین کی دعوت دیتے ہوئے داعی کی گفتگو کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں ہی نہ ہوں، اس کا مقصود حریف مقابل کو چُپ کرا دینا اور زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو، بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو، اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو، معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا ہونے نہ پائے۔ سیدھے طریقے سے اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دُور نہ نکل جائے۔

بحث و مباحثہ میں جذباتیت سے پرہیز

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (بنی اسرائیل: ۵۳)

"اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔"

یعنی کفار و مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی اور مبالغے اور عناد سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں مسلمانوں کو نہ تو کوئی بات خلافِ حق زبان سے نکالنی چاہیے، اور نہ غصّے میں آپے سے باہر ہو کر بے ہودگی کا جواب بے ہودگی سے دینا چاہیے، انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچی تلی ہو، برحق ہو اور ان کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

غصّہ اور شیطان کی اکساہٹ سے اجتناب

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بحث میں اگر غصّہ آجائے تو اسے شیطان کی اُکساہٹ سمجھا جائے۔ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (بنی اسرائیل: ۵۳)

"دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

اس لیے جب تمہیں مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصّے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اُکسا رہا ہے تاکہ دعوتِ دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوعِ انسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

غلط زبان سے احتیاط

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ

عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ

"اور (اے ایمان لانے والو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر وہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے کی نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دُور پھینک دے گی۔

مخالفت پر فتویٰ بازی سے پرہیز

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ

"تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے"

یعنی اہل ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے نہ آنے چاہئیں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے، اس چیز کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے وہی سب انسانوں کے ظاہر و باطن اور ان کے حال و مستقبل سے واقف ہے، اس کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس پر رحمت فرمائے اور کسے عذاب دے، انسان کو اصولی حیثیت سے تو یہ کہنے کا ضرور مجاز ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے

۱؎ تفہیم القرآن

کس قسم کے انسان رحمت کے مستحق ہیں اور کس قسم کے انسان عذاب کے مستحق ہیں مگر کسی انسان کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں شخص کو عذاب دیا جائے گا اور فلاں شخص بخشا جائے گا۔

غالباً یہ نصیحت اس بنا پر فرمائی گئی ہے کہ کبھی کبھی کفّار کی زیادتیوں سے تنگ آکر مسلمانوں کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے ہوں گے کہ تم لوگ دوزخ میں جاؤ گے یا تم کو خدا عذاب دے گا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا (بنی اسرائیل: ۵۴)

"ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔"

یعنی نبی کا کام دعوت دینا ہے۔ لوگوں کی قسمتیں اس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئیں ہیں کہ وہ کسی کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ کرتا پھرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی بنا پر اللہ آپؐ کو تنبیہ فرماتا ہے بلکہ دراصل مسلمانوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جب نبی تک کا یہ منصب نہیں ہے تو تم جنّت اور دوزخ کے ٹھیکیدار کہاں بنے جا رہے ہو۔[1]

تضحیک پر علیٰحدگی کا رویّہ

جب کفار اور مخالفین کی طرف سے خدا اور رسول کی تضحیک ہو تو ایسے غیض و غضب کے وقت دُعا کرتے ہوئے الگ ہو جانا چاہیے، فرمایا گیا ہے:

فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَقُلۡ سَلٰمٌ ۚ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ۝

(الزخرف: ۸۹)

"اچھا (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"

---

[1] تفہیم القرآن

یعنی ان کی سخت باتوں اور تضحیک و استہزا پر نہ ان کے لیے بد دُعا کرو نہ ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہو، بس سلام کر کے ان سے الگ ہو جاؤ اور نہ الگ ہونے میں اپنی ہار سمجھو، کہ لوگ کہیں گے کہ دیکھیے مقابلہ نہیں کر سکے اور میدان چھوڑ دیا۔

اسی طرح سورہ الجاثیہ آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (الزخرف: ۸۹)

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بڑے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے، ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔"

اس آیت کے دو مطلب بیان کیے جاتے ہیں، اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے، ایک یہ کہ اہل ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتی پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ ان کو اپنی طرف سے ان کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہ خدا میں جو اذیتیں انہوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اسے دے۔

اس آیت میں عفو و درگزر کا حکم ان عام حالات کے لیے ہے جن میں اہل ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سابقہ پیش آتے اور وہ انہیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں، اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے الجھنے

لے تفہیم القرآن

اور جھگڑنے اور ان کی ہر بے ہودگی کا جواب دینے پر نہ اُتر آئیں، جب تک شرافت اور معصومیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات ان حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے، مسلمان ان سے خود اُلجھیں گے تو اللہ ان سے نمٹنے کے لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا، درگزر سے کام لیں گے تو خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا

حکمت کی عمدہ مثال

یہاں قرآن ایک حکمت کی بات کا نمونہ پیش کرتا ہے، قرآن میں اس مقام پر سورہ سبا آیت ۲۴ میں پہلے سوال و جواب سے مخاطبین کو ایک ایسے منطقی نتیجہ پر پہنچا دیا گیا ہے جو اللہ ہی کی بندگی و پرستش کرتا ہے وہ ہدایت پر ہے اور جو اس کے سوا دوسروں کی بندگی بجالاتا ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہے، اس بنا پر بظاہر تو اس کے بعد کہنا یہی چاہیے تھا، کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہ ہو، لیکن اس طرح دوٹوک بات کہہ دینا حق گوئی کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی درست ہوتا حکمت تبلیغ کے لحاظ سے درست نہ ہوتا، کیونکہ جب کسی شخص کو مخاطب کر کے آپ صاف گمراہ کہہ دیں اور خود اپنے برسرِ ہدایت ہونے کا دعویٰ کریں تو وہ ضد میں مبتلا ہو جائے گا اور سچائی کے لیے اس کے دل کے دروازے بند ہو جائیں گے اللہ کے رسول چونکہ مجرد حق گوئی کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ ان کے سپرد یہ کام بھی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ حکیمانہ طریقہ سے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کریں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نبی، اس سوال کے جواب کے بعد اب تم ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ تم سب گمراہ ہو اور ہدایت پر صرف ہم ہیں اس کے بجائے تلقین یہ فرمائی گئی کہ انہیں اب یوں سمجھاؤ اور ان سے کہہ دو کہ

ہمارے اور تمہارے درمیان یہ فرق تو کھل گیا کہ ہم اسی کو معبود مانتے ہیں جو رزق دینے والا ہے، اور تم ان کو معبود بنا رہے ہو جو رزق دینے والے نہیں ہیں، اب یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور تم دونوں بیک وقت راہ راست پر ہوں، اس صریح فرق کے ساتھ تو ہم میں سے ایک ہی راہ راست پر ہو سکتا ہے اور دوسرا لامحالہ گمراہ ٹھہرتا ہے اس کے بعد یہ سوچنا تمہارا اپنا کام ہے کہ دلیل کس کے برسر ہدایت ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے اور کون اس کی رو سے گمراہ ہے:

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

"اب لامحالہ ہم میں اور تم میں کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔"

یہاں یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ اس بات پر سوچنا کہ راہ ہدایت کیا ہے، یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے کہ اس پر غور کریں۔ فرمایا گیا ہے:

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

"ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔"

اوپر کی بات سامعین کو پہلے ہی سوچنے پر مجبور کر چکی تھی، اس پر مزید ایک فقرہ فرما دیا گیا۔ تاکہ وہ اور زیادہ تفکر سے کام لیں، اس سے ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ہدایت اور گمراہی کے اس معاملہ میں ٹھیک فیصلہ کرنا ہم میں سے ہر ایک کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے، فرض کرو کہ ہم گمراہ ہیں تو اس گمراہی کا تقاضا خود ہی بھگتیں گے، تم پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لیے یہ ہمارے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں جا رہے ہیں، اسی طرح تم کو بھی ہماری کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ہی خیر خواہی کی خاطر جمنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ کہیں تم باطل نظریہ پر تو اپنی زندگی کی ساری پونجی نہیں لگا رہے ہو، اس معاملہ میں اگر تم نے ٹھوکر کھائی تو تمہارا اپنا ہی

نقصان ہوگا، ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔

حکمت تبلیغ کا ایک اعلیٰ نمونہ

قرآن پاک میں سورہ یٰسین آیت ۲۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

"آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے ؟"[1]

یہ دو جملے ایک صاحب ایمان کے ہیں جو تم کو دعوت دین دیتا ہے، اس میں پہلا فقرہ استدلال کا شاہکار ہے۔ اور دوسرے فقرے میں حکمت تبلیغ کا کمال دکھایا گیا ہے۔ پہلے فقرے میں وہ کہتا ہے کہ خالق کی بندگی کرنا تو سراسر عقل و فطرت کا تقاضا ہے، نامعقول اگر بات کوئی ہے تو وہ یہ کہ آدمی ان کی بندگی کرے جنہوں نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، نہ یہ کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے جس نے اسے پیدا کیا ہے دوسرے فقرے میں وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ مرنا آخر تم کو بھی ہے اور اسی خدا کی طرف جانا ہے جس کی بندگی اختیار کرنے پر تمہیں اعتراض ہے، اب تم خود سوچ لو کہ اس سے منہ موڑ کر تم کس بھلائی کی توقع کر سکتے ہو۔

گفتگو میں ہمدردی کا اہتمام

دیکھیے اس بندۂ خدا کی دعوت کے ان دو جملوں میں کتنی لطافت اور شیرینی ہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے :

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی

---

[1] تفہیم القرآن

اَنْ تَزَکّٰیۙ ۝ وَ اَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰیۚ ۝[1]

"فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے، اور میں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تاکہ (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزید ہدایت فرمائی گئی کہ:

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (طٰہٰ: ۴۴)

"تم اور ہارون دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔"

اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو ان آیات میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرا نمونہ سورۂ طٰہٰ آیت ۴۹ تا ۵۲، موسیٰ اور فرعون کے مکالمہ میں ہے:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی ۝

"فرعون نے کہا "اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے موسیٰ؟"

دونوں بھائیوں میں اصل صاحب دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے اس لیے فرعون نے انہی کو مخاطب کیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ خطاب کا رُخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارونؑ کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور خطابت کے پہلو میں وہ حضرت موسیٰؑ کے ضعف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو، جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہل مصر کا رب تو میں ہوں، سورہ نازعات میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

---

[1] تفہیم القرآن۔ النازعات: ۱۷ تا ۱۹۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى

(اے اہلِ مصر تمہارا ربِّ اعلیٰ میں ہوں۔"

سورۂ زخرف میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (رکوع ۵)

"اے قوم کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟"

سورہ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں ہنکارتا ہے:

يٰاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ اَطَّلِعُ اِلٰى اِلٰهِ مُوْسٰى (رکوع ۴)

"اے سردارانِ قوم" میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور بھی الٰہ ہے۔ اے ہامان ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تعمیر کرا تاکہ میں ذرا اوپر چڑھ کر یہ دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰ کسے الٰہ بنا رہا ہے۔"

سورۂ شعراء میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈانٹ کر کہتا ہے:

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝

"اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا"، (رکوع ۲)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرعون اپنی قوم کا واحد معبود تھا اور وہاں اور کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی، یہ بات ثابت ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رع یا راع) کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا، اور یہ بات بھی مصر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ "واحد مرکزِ پرستش ہونے کا نہ تھا" بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوعِ انسانی کی سیاسی

ربوبیت کا مدّعی تھا اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرماں روا ہو جس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔

اس کے اس سوال کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا جسے قرآن نے اس طرح نقل کیا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ○

"ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا۔"

"ہمارا رب وہ ہے" سے مراد یہ ہے کہ ہم ہر معنیٰ میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار۔ آقا۔ مالک۔ حاکم سب کچھ ہمارے نزدیک وہی ہے، کسی معنیٰ میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔

"جس نے ہر شے کو اس کی ساخت بخشی"

یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اس کے بنانے سے بنی ہے ہر چیز کو جو بناوٹ جو شکل و صورت، قوت و صلاحیت اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے اس کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے، ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی اور پاؤں کو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی غرض ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورت خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصّے کا کام ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔

پھر اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے، دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور دینے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہے، کان کو سننا اور

آنکھ کو دیکھنا اسی نے سکھایا ہے، مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے، درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اُگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے، غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں۔ ہادی اور معلم بھی ہے۔

اس بے نظیر جامع و مختصر جملے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے بلکہ یہ بھی بتادیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا، دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں آگئی ہے، ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجود خاص کے لیے اللہ کا ممنون احسان ہے اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا، جب تک اس کا دل اور پھیپھڑے اور اس کا معدہ وجگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

مزید برآں اسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی، جس کے ماننے سے فرعون کو انکار تھا، ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے اور جو ہر چیز کو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالمگیر منصب ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے اور انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہوسکتی جو مچھلی اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے، اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتائے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مدلل جواب پر فرعون نے پھر دوسرا سوال

کیا، کہنے لگا:

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ : ۵۱)

"اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں، ان کی پھر کیا حالت تھی۔"

یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا اس کے سوا اور کوئی دوسرا رب نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو صدہا نسل سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ عذاب کے مستحق تھے؟ کیا ان سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟ یہ تھا فرعون کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی اس دلیل کا جواب، ہو سکتا ہے کہ یہ جواب اس نے بربنائے جہالت دیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ بربنائے شرارت، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی وہ خود اس بات پر جھلّا گیا ہو کہ اس مذہب سے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ مقصد بھی ہو کہ اپنے اہل دربار اور عام اہل مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے، اہل حق کی تبلیغ کے خلاف یہ ہتھکنڈا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشتعل کرنے کے لیے بڑا مؤثر ثابت ہوا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی ہتھکنڈے سے کام لیا جا رہا تھا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں فرعون کی اس مکاری کا ذکر یہاں برمحل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمال تدبر سے اس کے شرارت آمیز سوال کا جواب دیا:

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ

---

[1] تفہیم القرآن

وَلَا يَنسَى (طٰہٰ : ۵۲)

"اس کا علم تو میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے، میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔"

قرآن نے یہ حکیمانہ جواب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش فرمایا ہے، ہمیں حضرت موسیٰ کے جواب سے حکمت تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے، فرعون کا مقصد بظاہر سامعین سے اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا اگر اس آیت میں حضرت موسیٰؑ یہ کہتے کہ وہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا، اس لیے آنجناب نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا، اور ساتھ ساتھ فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے، آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں، ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے، نہ خدا کی نگاہ سے بچی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظہ سے کوئی شے محو ہوئی ہے، ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے اس کو وہی جانتا ہے، مجھے اور تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا موقف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا، ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں ضدی مخاطب کی ہٹ دھرمی کو توڑنے کا ایک حکیمانہ طریقہ موجود ہے۔ جب مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو اس کا حق کو قبول کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے، اس وقت داعی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں ایسا رنگ اختیار

کرے کہ مخاطب کے سامنے یہ بات نہ رہے کہ متکلم کی بات کو مجھے ماننا ہے یا اسے رد کرنا ہے بلکہ اسے ایسے اسٹیج پر لے آئے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ میرا مفاد کس میں ہے اس کو قبول کرنے میں یا اسے رد کرنے میں۔

سورہ الفرقان آیت ۱۱ تا ۱۶ میں اسی حکیمانہ طرزِ عمل کا ایک بہترین رنگ پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۴ تا ۱۰ میں کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے ان سب بے جا الزامات کا ذکر فرمایا ہے، جو ایک ضدّی انسان بغیر سوچے سمجھے لگایا کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کیسے نبی ہیں، وہ کھانا کھاتے ہیں، بازاروں میں از خود سودا سلف خریدنے کے لیے جاتے ہیں، اگر کسی انسان کو نبی بنانا ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ لگا دیتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے لوگوں کو دھمکاتا پھرتا اور کہتا کہ مانو اس رسول کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں حکمت تبلیغ کا ایک اور بے مثل نمونہ قابل ملاحظہ ہے۔ سورہ الشعراء آیت ۲۳ تا ۲۸ میں جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ :

فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ○

میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا ہے اور مجھے رسولوں میں شامل کر لیا ہے۔"

اس پر فرعون نے کہا :

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِينَ ○

"یہ رب العلمین کیا ہوتا ہے،،؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا :

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○

"کہ آسمانوں اور زمین کا رب، اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان

اور زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو۔"

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں زمین پر بسنے والی کسی مخلوق اور فانی مدعی ملوکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے، اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک و فرماں روا ہے۔ تو تمہیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہونی چاہیے کہ سارے جہان کا رب کون ہے۔ اس پر فرعون کہنے لگا:

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○

"فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا "سنتے ہو"؟

گویا وہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان باغیانہ کلمات کی طرف متوجہ کر رہا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○

موسیٰؑ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں"۔

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے یہ اطلاع دی کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں، تمہارا یہ یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں، میں صرف اس رب کی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں ان سب کا بھی رب تھا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سوال و جواب پر فرعون نے لاچار ہو کر کہا:

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○

"فرعون نے (حاضرین سے کہا) "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، پاگل معلوم ہوتے ہیں"۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے سابقہ دلیل کی تکمیل کی اور اضافہ کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

موسیٰؑ نے کہا "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"

گویا مجھے تو پاگل قرار دیا جارہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارہ فرعون ہے جو زمین کے ذرا سے رقبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مصر سمیت ہر چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے، میں تو فرماں روائی اس کی مانتا ہوں اور اس کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

دلیل کے میدان میں لاچار ہو کر فرعون کے لیے تسلیم و رضا کا مسلک بھی ہو سکتا تھا لیکن تکبر و غرور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لیے پھر اس نے سینہ زوری کا راستہ اختیار کیا اور کہنے لگا:

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝[1]

"اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں"

اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی "معبود" کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا یعنی یہ کہ بس اسے پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس کے استمداد و استعانت کے لیے دعائیں مانگیں لیکن کسی معبود کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کو قانونِ

---

[1] تفہیم القرآن

برتر مان کر اس کے آگے جُھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرماں رواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں، وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آتے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختار مطلق ہیں، کسی معبود کو ہماری سیاست، ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے ــــ حکومتوں اور بادشاہوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے، انہوں نے ان سے خداوند عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعویٰ پیش کرتی رہی ہیں، بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم اور باغی ٹھہرایا ہے جو اس کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبود مانے، اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے، اگر معاملہ صرف پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ ربّ العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں، اگر صرف اسی معنیٰ میں توحید العبادات کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضبناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی، زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دین آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا کہ میرے مذہب کے پنڈتوں سے مناظرہ کر لو لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ربّ العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ وہ گویا ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آکر اس سے اطاعت امر کا مطالبہ کر رہا ہے، اس معنیٰ میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری ماننے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم برتر مانے، اسی لیے اس نے پہلے ربّ العالمین کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف

سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبودیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدار اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا، پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس ربُّ العالمین کا وہ پیغام لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف دھمکی دے دی کہ ملک مصر میں تم نے میرے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

اس کے اس لایعنی جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تو میرے ربُّ العالمین کے نمائندہ ہونے کا انکار ہی کرتا رہے گا، اگرچہ میں صریح دلیل لے آؤں ؟

قَالَ اَوَلَوْجِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۝

موسیٰؑ نے کہا اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی"؟

یعنی کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جب کہ میں اس امر کی صریح دلیل پیش کروں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو ربُّ العالمین۔ ربُّ السّمٰوٰت والارض اور ربُّ المشرق والمغرب ہے ؟۔

اس بات پر فرعون نے عام مشرکین کی طرح فوق الفطری صریح نشانی کا مطالبہ کر دیا۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝

فرعون نے کہا " اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے "۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم وجدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا، وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ کے اِلٰہ الآلِہہ ہونے کو مانتا تھا اور انہی کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اگر تجھے

میرے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں، اور اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی نشانی، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالک کائنات ہونے ہی میں اسے کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا، نشانی کی بات تو اس صورت میں درمیان میں آ سکتی تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کا قادر مطلق ہونا تو تسلیم ہو، اور بحث اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

اب حضرت موسیٰ ؑ کی حکمت تبلیغ کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے، کہنے لگے:

وَقَالَ مُوسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (القصص: ۳۷)

موسیٰ ؑ نے جواب دیا "میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے، حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔"

یعنی مجھے تو ساحر اور افترا پرداز قرار دیتا ہے، لیکن میرا رب میرے حال سے خوب واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس کی طرف سے رسول مقرر کیا گیا ہے وہ کیسا آدمی ہے، اور آخری انجام کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے، میں جھوٹا ہوں تو میرا انجام برا ہوگا اور تو جھوٹا ہے تو پھر خوب جان لے کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہے بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ظالم کے لیے فلاح نہیں ہے، جو شخص خدا کا رسول نہ ہو اور جھوٹ موٹ رسول بن کر اپنا کوئی مفاد حاصل کرنا چاہے وہ بھی ظالم ہے اور فلاح سے محروم رہے گا، اور جو طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر سچے رسول کو جھٹلائے اور مکاریوں سے صداقت کو دبانا چاہے تو وہ بھی ظالم ہے اور اسے کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔

حق کے مقابلے میں باطل کا اندازِ استدلال

تاریخ کے ہر دور میں باطل کے پاس حق کے مقابلے میں ہٹ دھرمی، الزام تراشی اور یاوہ گوئی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے، اس بات کو قرآن نے کہا ہے:

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ○

"کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔"

باطل پرست حق کے مقابلے میں عناد اور تعصب سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ ان کا دامن معقول دلائل سے ہمیشہ خالی ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلل اصولی دعوت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایک شخص کہتا ہے لوگو، یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں، جواب میں شرک کے معقول ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی، بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے، وہ کہتا ہے کہ کائنات کا سارا انتظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت ہیں، جواب میں شور بلند ہوتا ہے کہ یہ جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑے گئے ہو، تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی، یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی امور دلالت کرتے ہیں، جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاعر ہے، وہ کہتا ہے کہ

میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں، اور یہ ہے وہ تعلیمِ حق، جواب میں اس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی، بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے، وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے اور اس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیروؤں کی زندگی میں ہو رہا تھا، مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے، پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردلی میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزینہ نہیں ہے؟ غرض یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بے تکی باتیں ہانک رہا ہے۔

اس کے بعد ان کی تجویز کردہ چیزوں کے بارے میں فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ٥

(الفرقان : ۱۰)

"بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، ایک نہیں بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور بڑے بڑے محل۔"

تبارک: کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنیٰ ہیں "بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے" غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے" اس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے:

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ
سَعِيْرًا ٥ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا
وَّزَفِيْرًا ٥ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا

هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ○ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ○ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ○ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ○ (الفرقان : ۱۱ تا ۱۶)

"اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اس گھڑی" کو جھٹلا چکے ہیں۔ اور جو اس گھڑی کو جھٹلاتے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے، وہ جب دُور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے جوش اور غضب کی آواز سُن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے (اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو۔ ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنّت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے جو ان کے عمل کی جزا اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی، جس میں اُن کی ہر خواہش پوری ہوگی جس میں ہمیشہ رہیں گے جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔"

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس گھڑی کو جھٹلا چکے ہیں یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ واقعی کسی قابل لحاظ دلیل کی بنا پر قرآن کے جعلی کلام ہونے کا شبہ ہے، یا ان کو درحقیقت یہ گمان ہے کہ جن آزاد کردہ غلاموں کا یہ نام لیتے ہیں وہی تم کو سکھاتے پڑھاتے ہیں یا انہیں تمہاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو۔ یا وہ تمہاری تعلیم حق کو مان لینے کے لیے تیار تھے مگر صرف اس لیے رک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمہاری اردلی میں تھا اور نہ تمہارے لیے کوئی خزانہ اُتار اگیا تھا، اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی

نہیں ہے، بلکہ آخرت کا انکار ہے جس نے ان کو حق اور باطل کے معاملے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اور تمہاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لیے ایسی ایسی مضحکہ خیز حجتیں پیش کرنے لگتے ہیں، ان کے ذہن اس تخیل سے خالی ہیں کہ اس زندگی کے بعد اور زندگی بھی ہے۔ جس میں انہیں خدا کے سامنے جاکر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس چار دن کی زندگی کے بعد مرکر سب کو مٹی ہو جانا ہے بت پرست بھی مٹی ہو جائے گا اور خدا پرست بھی اور منکرِ خدا بھی، نتیجہ کسی چیز کا بھی کچھ نہیں نکلنا ہے، پھر کیا فرق پڑجاتا ہے مشرک ہو کر مرنے اور موحّد یا ملحد ہو کر مرنے میں، صحیح اور غلط کے امتیاز کی اگر ان کے نزدیک کوئی ضرورت ہے تو اس دنیا کی کامیابی و ناکامی کے لحاظ سے ہے اور یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کسی عقیدے اور اخلاقی اصول کا بھی کوئی متعیّن نتیجہ نہیں ہے جو پوری یکسانی کے ساتھ ہر شخص اور ہر رویے کے معاملے میں نکلتا ہو، دہریے، آتش پرست اور عیسائی، موسائی، ستارہ پرست، بُت پرست اور ہر اچھے اور بُرے دونوں ہی طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں، کوئی ایک عقیدہ نہیں جس کے متعلق تجربہ بتاتا ہو کہ اسے اختیار کرنے والا، یا رد کر دینے والا اس دنیا میں لازماً بدحال رہتا ہو، بدکار اور نیکوکار بھی یہاں ہمیشہ اپنے اعمال کا ایک ہی مقدر نتیجہ نہیں دیکھتے، ایک بدکار مزے کر رہا ہے اور دوسرا سزا پا رہا ہے۔ ایک نیکوکار مصیبت جھیل رہا ہے۔ تو دوسرا مغرور محترم بنا ہوا ہے۔ لہٰذا دنیوی نتائج کے اعتبار سے کسی مخصوص اخلاقی رویے کے متعلق بھی منکرِ آخرت اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ خیر ہے یا شر ہے، اس صورت حال میں جب کوئی شخص ان کو ایک عقیدے اور اخلاقی ضابطے کی طرف دعوت دیتا ہے تو خواہ کیسے ہی سنجیدہ اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں دعوت پیش کرے، ایک منکرِ آخرت کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا۔ بلکہ طفلانہ اعتراضات کرکے اسے ٹال دے گا۔

منکرین اور ضدی ہٹ دھرم لوگوں کا بدانجام ذکر کرکے اس بات پر توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ انجام بہتر ہے اور خدا سے ڈرنے والوں اور پرہیزگاروں کے لئے ابدی جنّت کا ضامن ہے جس کا وعدہ ربُّ العٰلمین کرچکے ہیں، اس میں فرمایا وَعْدًا مَّسْئُوْلًا یعنی ایسا وعدہ جس کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک شخص سوال اُٹھا سکتا ہے کہ جنّت کا وعدہ اور دوزخ کا ڈراوا کسی ایسے شخص پر کیا اثرانداز ہوسکتا ہے جو قیامت اور حشر ونشر اور جنّت و دوزخ کا پہلے ہی منکر ہو؟ اس لحاظ سے تو یہ بظاہر ایک بے محل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، اگر معاملہ یہ ہو کہ میں بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا، تو بحث و حجّت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، لیکن اگر میں اپنے مخاطب سے اس انداز میں گفتگو کررہا ہوں کہ زیر بحث مسئلہ میری بات ماننے کا نہیں بلکہ تمہارے مفاد کا ہے، تو مخاطب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے، اس صورت میں مخاطب کو خود اپنی بھلائی کے نقطہ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہر حال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے اور امکان دونوں کا ہی ہے۔ اب اگر دوسری زندگی نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھ رہے ہیں، تو ہمیں بھی مرکر مٹی ہوجانا ہے اور آخرت کے قائل کو بھی، اس صورت میں دونوں برابر رہیں گے۔ لیکن اگر کہیں بات وہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے تو یقیناً پھر ہماری خیر نہیں ہے، اس طرح یہ طرز کلام مخاطب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنّت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جانے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کررہا ہو۔

فہمِ دین کا حکیمانہ طریقہ

قرآن نے اس کا عمدہ طریقہ سورہ الشعراء آیت ۷۰ تا ۷۶ میں بیان کیا ہے جب ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ اور قوم سے مخاطب ہوتے ہیں اور سوال فرماتے ہیں کہ

مَا تَعْبُدُوْنَ ○

"یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو"؟

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ○

"انہوں نے جواب دیا: کچھ بت ہیں جن کو ہم پوجا کرتے ہیں اور انہیں کی سیوا میں لگے رہتے ہیں"

يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ○ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ○

"اس نے پوچھا: کیا یہ تمہاری سنتے ہیں، جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟"

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○

"انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے"

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ○ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ○

"اس پر ابراہیمؑ نے کہا کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی ہے جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجا لاتے رہے"

یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آرہا ہے کیا نسل در نسل بس یونہی آنکھیں بند کر کے لکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجا لا رہے ہیں ان کے

اندر خدائی کی واقعی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ تو اس پر یوں چوٹ لگاتے ہیں

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"میرے تو یہ سب دشمن ہیں سوائے ایک رب العٰلمین کے"

یعنی جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش کروں گا تو میری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت کو بے نفع اور بے ضرر نہیں بلکہ الٹا نقصان دہ سمجھتا ہوں، اس لیے میرے نزدیک اس کو پوجنا تو دشمن کو پوجنا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے اس قول میں اس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورہ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

"انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں، ہرگز نہیں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ اور الٹے ان کے مخالف ہوں گے"

یعنی قیامت کے دن وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اور صاف کہہ دیں گے ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، نا ہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

حکمت تبلیغ کا ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے، حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے، بخلاف اس کے جب انہوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخاطب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور برے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے، اس طریقہ سے حضرت ابراہیمؑ نے

گویا ہرانسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیرخواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کبھی اپنا بُرا نہیں چاہتا، انہوں نے اسے بتایا کہ میں تو خود ان کی بندگی میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ و دانستہ میں اپنی بدخواہی نہیں کرسکتا، لہٰذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے اجتناب کرتا ہوں اس کے بعد مخاطب فطرتاً سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو۔

غور و فکر کی دعوت

اللہ تعالیٰ نے سورہ النمل۔ آیت (۵۹) میں فرمایا ہے:

آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (ان سے پوچھو)

"اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں[1]؟"

بظاہر یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بہتر ہے یا یہ معبودانِ باطل۔ حقیقت کے اعتبار سے تو معبودان باطل میں سرے سے کسی خیر کا سوال ہی نہیں ہے کہ اللہ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رہے مشرکین تو وہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ اللہ کا اور ان معبودوں کا کوئی مقابلہ ہے، لیکن یہ سوال ان کے سامنے اس لیے رکھا گیا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوں۔ ظاہر ہے کوئی شخص دنیا میں کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے نزدیک اس میں کسی بھلائی یا فائدے کا خیال نہ رکھتا ہو۔ اب اگر یہ مشرک لوگ اللہ کی عبادت کے بجائے ان معبودان باطل کی عبادت کرتے تھے اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے۔ تو یہ اس کے بغیر بالکل بے معنیٰ تھا کہ ان معبودوں میں کوئی خیر ہو۔ اسی بنا پر ان کے سامنے صاف الفاظ میں یہ سوال رکھا گیا

---

[1] تفہیم القرآن

کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا تمہارے یہ معبود ؟ کیونکہ اس دوٹوک سوال کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی، ان میں سے کوئی کٹر سے کٹر مشرک بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ ہمارے معبود بہتر ہیں۔ اور یہ مان لینے کے بعد کہ اللہ بہتر ہے ان کے پورے کے پورے دین کی بنیاد ڈھے جاتی تھی۔ اس لیے کہ پھر یہ بات سراسر معقول قرار پاتی تھی کہ بہتر کو بہتر چھوڑ کر بدتر کو اختیار کیا جائے۔

اس طرح قرآن نے تقریر کے پہلے ہی فقرے میں مخالفین کو بے بس کر دیا، اس کے بعد اب پے در پے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک کرشمے کی طرف انگلی اُٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس کے ہیں ؟ ایک اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے ؟ اگر نہیں ہے تو پھر یہ دوسرے آخر کیا ہیں کہ انہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کی تلاوت فرماتے تو فوراً اس کے جواب میں فرماتے:

بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى وَ اَجَلُّ وَ اَكْرَمُ

"نہیں بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے"

غافل قوم کو چونکانے کی تدابیر

قرآن میں سورہ الشعراء آیت ۱۰۳ میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

"یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے میں نشانی کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ مشرکین عرب بالخصوص مکہ کے لوگ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے تھے، مگر دوسری طرف اسی شرک میں مبتلا تھے جس کے خلاف جدوجہد کرتے ان کی عمر بیت گئی تھی اور ان کے لائے ہوئے دین کی دعوت اب جو نبی پیش کر رہا تھا اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ ان کو یاد دلایا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ تو شرک کے دشمن اور دعوتِ توحید کے علمبردار تھے، یہ خود بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرت ممدوح مشرک نہ تھے۔ مگر پھر بھی یہ اپنی ضد پر قائم ہیں، دوسرا پہلو اسی قصہ میں نشانی کا یہ ہے کہ قوم ابراہیم دُنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوئی تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیل و اسحاق) کی اولاد ہی کو نصیب ہوئی، قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار مغضوب قوموں ہی میں کیا گیا ہے:

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِکٰتِ (التوبہ : ۹)

"کیا ان لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوحؑ کی قوم عادؑ، ثمودؑ، ابراہیمؑ کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنہیں اُلٹا دیا گیا"

اہل کتاب اور دعوت دین

قرآن نے اہل کتاب کے سامنے دعوت حق پیش کرنے کا حکیمانہ طریقہ بتایا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُکُمْ وَّاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (العنکبوت : ۴۶)

"اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو، مگر عمدہ طریقہ سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے، ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں"

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو، مگر عمدہ طریقہ سے یعنی مباحثہ معقول دلائل

لہ ۲ہ تفہیم القرآن

کے ساتھ، مہذّب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے، مبلغ کو اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار سکے اور اسے راہ راست پر لائے، اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مطلب اپنے مدمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے، جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے مگر یہ اہل کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۵)

"دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو"

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ
هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ
وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ؂ (حٰم السجدہ : ۳۴)

"بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہے (مخالفین کے حملوں کی مدافعت) ایسے طریقہ سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

تمہارے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔''

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ○ (المومنون : ۹۶)

''تم بدی کو اچھے طریقہ سے دفع کرو۔ ہمیں معلوم ہے جو باتیں (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔''

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ○ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ (الاعراف : ۱۴۴)

''درگزر کی روش اختیار کرو، بھلائی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو۔ اور اگر ترکی بترکی جواب دینے کے لیے شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔''

اللہ تعالیٰ نے خود اس عمدہ طریق بحث کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغ حق کی خدمت انجام دینے والے کو اختیار کرنا چاہیے اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمہیں بحث کرنی ہو اس کی گمراہی کو بحث کا نقطۂ آغاز نہ بناؤ بلکہ بات اس سے شروع کرو کہ حق و صداقت کے کون سے اجزا ہیں جو تمہارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں، یعنی آغاز کلام نکاتِ اختلاف سے نہیں بلکہ نکاتِ اتفاق سے ہونا چاہیے۔ پھر انہی متفق علیہ امور سے استدلال کر کے مخاطب کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جن امور میں تمہارے اور اس کے درمیان اختلاف ہے، ان میں تمہارا مسلک متفق علیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے، اور اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔

اس سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کی طرح وحی و رسالت

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح ان سب حقیقتوں کو مانتے تھے، ان بنیادی امور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیادِ اختلاف ہو سکتی تھی، تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے ہاں آئی ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی انہیں دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انہیں کافر قرار دیتے، یہ جھگڑے کی بڑی مضبوط وجہ ہو سکتی تھی، لیکن مسلمانوں کا موقف اس سے مختلف تھا، وہ تمام ان کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہل کتاب کے پاس موجود تھیں، اور پھر اس وحی پر ایمان لائے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ بتانا اہل کتاب کا کام تھا کہ کس معقول وجہ سے وہ خدا ہی کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہل کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا یہی موقف ان کے سامنے پیش کرو۔ ان سے کہو کہ جس خدا کو مانتے ہو اسی کو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں، اس کی طرف سے جو احکام و ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں، ان سب کے آگے ہمارا سر تسلیم خم ہے، خواہ تمہارے ہاں آئی ہوں یا ہمارے ہاں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں، ملک اور قوم اور نسل کے بندے نہیں ہیں کہ ایک خدا کا حکم آئے تو ہم مانیں اور وہی حکم خدا دوسری جگہ آئے تو ہم اس کو نہ مانیں۔

اشتعال سے شدید پرہیز

دعوتِ دین دینے کے لیے دعوتِ فکر دینے کے ساتھ ساتھ مخاطب کے جذبات کو مشتعل نہ ہونے دینا۔ قرآن نے یہ آیت دی ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (یونس : ۳۱)

"ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے ؟ یہ سماعت اور بینائی کی توفیق کس کے اختیار میں ہے ؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے ؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ، کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) کیوں پرہیز نہیں کرتے"

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۔

"تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے"

یعنی یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود مانتے ہو، تب تو تمہارا حقیقی پروردگار، مالک، آقا اور تمہاری بندگی اور عبادت کا حقدار اللہ ہی ہوا یہ دوسرے جن کا ان کاموں میں کوئی حصہ نہیں آخر ربوبیت میں کہاں سے شریک ہو گئے ؟

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (یونس : ۳۲)

"پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا ؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو ؟"

خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے، اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ تم کدھر پھرے جا رہے ہو، بلکہ یہ ہے کہ "تم کدھر پھرائے جا رہے ہو ؟" اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں سے یہ اپیل کی جا رہی ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو۔ اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے، یہ طرز سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغہ مجہول کے پردے میں چھپایا گیا ہے تاکہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کر سکیں

اور کسی کو یہ کہہ کر انہیں اشتعال دلانے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو یہ تمہارے بزرگوں اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں، اس میں حکمت تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ رہنا چاہیے۔

اصولوں میں ثابت قدمی اور عدم مداہنت

قرآن نے یہ راستہ دکھایا ہے کہ مومنین کو چاہیے کہ وہ اپنی نیکی سے ظالموں کی برائیوں کو شکست دیں۔ فرمایا ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (ہود: ۱۱۲ تا ۱۱۵)

"پس اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے، اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو، جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے، ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنّم کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور کہیں سے تمہیں امداد نہ پہنچے گی، اور دیکھو نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں، اور صبر کرنا، اور اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی

ضائع نہیں کرتا۔“

فرمایا گیا ہے، کہ نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں، یعنی برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوتِ حق کی دشمنی میں کی جارہی ہیں ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی، جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا مقابلہ کرسکو گے۔ بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کرسکو گے۔

مواقعِ تبلیغ سے استفادہ

قرآن میں بیان کیے گئے واقعہ حضرت یوسف علیہ السّلام سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی تبلیغ کے لیے کس طرح موقع نکالا، اس میں ہم کو حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے، دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَقَالَ الۡاٰخَرُ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡكُلُ الطَّيۡرُ مِنۡهُ ؕ نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰٮكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ (یوسف: ۳۶)

”قید خانے میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے، ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا ”میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں“ دوسرے نے کہا کہ ”میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں“۔ دونوں نے کہا ”ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں۔“

جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا، مگر پہلے یہ سن لو

کہ اس علم کا مآخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر بتاتا ہوں۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي (یوسف : ۳۷)

"یوسف نے کہا "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا، یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔"

اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ نے ان کے سامنے اپنے دین کی دعوت پیش کرنا شروع کر دی:

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ (یوسف : ۳۸)

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے، ہمارا یہ کام نہیں کہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائیں، درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا)، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے، جسے دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی، اس کے

۱؎ تفہیم القرآن

سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ اسے کبھی محسوس نہیں کرتا، کہ یہ موقع ہے یعنی بات کہنے کا، مگر وہ جسے دھن لگی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے لیچڑپن اور جھگڑالوپن سے انہیں الٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے، حضرت چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول و ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطۂ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستہ سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؁

"اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔"

اور اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقہ سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان سے مخاطب تھے، ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہوگی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے

۱؎ تفہیم القرآن

آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی، پھر یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو۔ اور میرے دین میں آجاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے، اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑا کر دوسروں کو اپنا رب بناتے ہیں، پھر اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر نہایت معقولیت کے ساتھ، اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر، بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف: ۴۰)

"اس غالب و قاہر اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی، فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یعنی یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب خالی خول نام ہی ہیں ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو اور اس نے ان میں سے کسی کے لیے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرماں روائی کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لیے

مخصوص کر رکھے ہیں۔ اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

حکمتِ تبلیغ کی ایک اور مثال

حکمتِ تبلیغ کی ایک اور مثال اسی سورہ یوسف کے آخر میں دی گئی ہے۔ قصۂ یوسف بیان کرنے کے بعد بات کو ختم کرنے سے پہلے اپنے مقصد کی بات بھی سُنادی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قصۂ یوسف کو تو اہل مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور حجت بازی کے معلوم کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ آپؐ بیان نہیں کرسکیں گے لیکن جب قرآن نے یہ واقعہ بڑی خوبصورتی اور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اور سب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تو سورۃ کے آخر میں جیسے ہی قصہ ختم کیا تو چند جملے اپنے مطلب کے بھی کہہ دیے جو نہایت درجہ اختصار سے بیان کیے ہیں اور ان چند جملوں ہی میں نصیحت اور دعوت کا سارا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○ (یوسف: ۱۰۶)

"زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے، ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔"

(توجہ نہیں کرتے) اس سے مقصد لوگوں کو ان کی غفلت پر متوجہ کرنا ہے، زمین اور آسمان کی ہر چیز بجائے خود اپنی جگہ محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے، حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے، جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ انسانوں کا سا دیکھنا نہیں بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا دیکھتے ہیں۔ درخت کو درخت اور پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان چیزوں کا مصرف بھی جانتا ہے، مگر جس

مقصد کے لیے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے وہ صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مصرف اور استعمال معلوم کرے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی حقیقت کی جستجو اور ان نشانیوں کے ذریعہ سے ان کا سراغ لگاتے، اسی معاملہ میں اکثر انسان غفلت برتتے رہے ہیں اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر دلوں پر یہ قفل نہ چڑھا لیا ہوتا تو انبیاء کی بات سمجھنا اور ان کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانا کس قدر مشکل ہو جاتا۔

(اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں) یہ فطری نتیجہ ہے اس غفلت کا جس کی طرف اوپر کے فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے نشان راہ سے آنکھیں بند کیں تو سیدھے راستے سے ہٹ گئے، اور اطراف کی جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گئے، اس پر بھی کم انسان ایسے ہیں جو منزل کو بالکل ہی گم کر چکے ہوں اور جنہیں اس بات سے قطعی انکار ہو کہ خدا ان کا خالق و رزاق ہے بیشتر انسان جس گمراہی میں مبتلا ہیں، وہ انکارِ خدا کی گمراہی نہیں بلکہ شرک کی گمراہی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا کی ذات اور اس کی صفات، اختیارات اور حقوق میں دوسرے بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں، یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہوتی۔ اگر زمین و آسمان کی ان نشانیوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جو ہر جگہ اور ہر آن خدا کی وحدت کا پتا دے رہی ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے:

أَفَأَمِنُوٓا۟ أَن تَأْتِيَهُمْ غَـٰشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ ٱللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ ٱلسَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (یوسف: ۱۰۷)

"کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کی طرف سے کوئی عذاب آ کر انہیں دبوچ نہ لے گا یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی۔"

اس سے مقصد لوگوں کو چونکانا ہے کہ فرصت زندگی کو دراز سمجھ کر اور حال

کے امن کو دائم خیال کر کے فکر مآل کو کسی آنے والے وقت پر نہ ٹالو۔ کسی انسان کے پاس بھی اس امر کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کی مہلت حیات فلاں وقت تک یقیناً باقی رہے گی، کوئی نہیں جانتا کہ کب اچانک اس کی گرفتاری ہو جاتی ہے، اور کہاں سے کس حال میں وہ پکڑ کر بلایا جاتا ہے، تمہارا شب و روز کا تجربہ ہے کہ پردۂ مستقبل ایک لمحہ پہلے بھی خبر نہیں دیتا کہ اس کے اندر تمہارے لیے کیا چھپا ہوا ہے۔ لہٰذا کچھ فکر کرنی ہے تو ابھی کر لو۔ زندگی کی جس راہ پر چلے جا رہے ہو اس میں آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھہر کر سوچ لو کہ کیا یہ راستہ ٹھیک ہے، اس کے درست ہونے کے لیے کوئی واقعی حجت موجود ہے؟ اس کے راہ راست ہونے کی کوئی دلیل آثار کائنات سے مل رہی ہے۔ اس پر چلنے کے جو نتائج تمہارے ابنائے نوع پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ اور جو نتائج اب تمہارے تمدن میں رونما ہو رہے ہیں۔ کیا وہ یہی تصدیق کرتے ہیں کہ تم ٹھیک جا رہے ہو؟

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؀

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

دعوتِ حق باوقار انداز میں

دعوتِ حق پیش کرنا ایک باوقار کام ہے، یہ پیچھے پڑ کر کرنے کا کام نہیں ہے سورۃ الذاریات ۵۴ میں فرمایا گیا ہے:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ؀

"ان سے رُخ پھیر لو۔ تم پر کچھ ملامت نہیں ہے۔"

اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک داعی حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت صاف صاف پیش کر دے اور اس کے شبہات و اعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے، اس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ و خیال پر جما رہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعیٔ حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضروری نہیں کہ وہ اسی شخص کے پیچھے پڑا رہے، اس سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنانا ہے داعی اپنا فرض ادا کر چکا، وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ قاعدہ اس لیے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ آپؐ دینی تبلیغ میں بے جا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعیٔ حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکا ہوتا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑالو پن کے آثار دیکھ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ واہ صاحب، آپ اچھے دعوت حق کے علمبردار ہیں۔ ہم آپ سے سمجھنے کے لیے بحث کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہماری طرف التفات ہی نہیں کرتے، حالانکہ ان کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی بحثا بحثی میں داعی کو اُلجھانا اور محض اس کی تضیع اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام پاک میں بالفاظ صریح یہ فرما دیا کہ "ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو، ان سے بے التفاتی کرنے پر تمہیں

کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی"۔ اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپؐ لے کر آتے ہیں اس کی رو سے تو آپؐ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں، پھر آپؐ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

دعوتِ حق کا تسلسل

قرآن پاک میں دعوت دین کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے :

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ○ (الذّٰریات:۵۵)

"البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے"

اس آیت میں تبلیغ دین کا ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے، دعوت حق کا اصل مقصد ان سعید رُوحوں تک ایمان کی نعمت پہنچانا ہے، جو اس نعمت کے قدر شناس ہوں، اور اسے خود حاصل کرنا چاہیں، مگر داعی کو معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید رُوحیں کہاں ہیں، اس لیے اس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوت کا سلسلہ برابر جاری رکھے۔ تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں، وہاں اس کی آواز پہنچ جائے، یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں، انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے، اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لا کھڑا کرنا اس کے پیش نظر ہونا چاہیے، بیچ میں اولادِ آدم کا جو فضول عنصر اس کو ملے اس کی طرف بس اسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنس کاسد ہے، اس کے کساد و فساد کا تجربہ ہو جانے کے بعد اسے اپنا قیمتی وقت اس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ اس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں اور ان پر اپنی قوت صرف کرنے سے نقصان ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اُٹھانے والے ہیں۔

قابلِ اعراض لوگ

قرآن مجید نے انسانوں کی اقسام کے لحاظ سے بعض لوگوں کی اہمیتِ دین کے بارے میں اعراض کا مشورہ دیا ہے۔ چنانچہ سورہ النجم آیت ۲۹ میں ان لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے جن کے پیچھے داعی کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ[1]

"پس اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا اسے کچھ مطلب نہیں ہے، اسے اس کے حال پہ چھوڑ دو۔"

یعنی ان کے پیچھے نہ پڑو اور اسے سمجھانے پر بھی اپنا وقت ضائع نہ کرو، کیونکہ ایسا شخص کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا، جس کی بنیا دخدا پرستی پر ہو، جو دنیا کے مادی فائدوں سے بلند تر ہو کر مقاصد اور اقدار کی طرف بلاتی ہو اور جس میں اصل مطلب آخرت کی ابدی فلاح و کامرانی کو قرار دیا جارہا ہے۔ اس قسم کے مادہ پرست اور خدا بیزار انسان پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے توجہ ان لوگوں کی طرف کرو جو خدا کا ذکر سننے کے لیے تیار ہوں اور دنیا پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ان کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔

یعنی یہ لوگ دنیا اور اس کے فوائد سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں اس لیے ان پر محنت صرف کرنا لاحاصل ہے۔ اور سورہ الانعام میں اس

---

[1] تفہیم القرآن

مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا
وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ (الانعام : ۷۰)

"چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے
انہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔"

اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے صرف طالب حق کی اہمیت ہے، حق سے بے نیازی برتنے والے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، سورہ عبس کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل پر تبصرہ فرمایا ہے جو حضرت ابن ام کلثومؓ کی آمد پر آپؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ معاملہ کی اصل نوعیت یہ تھی کہ جب بھی کوئی داعی اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو فطری طور پر اس کا رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے بااثر لوگ اس کی دعوت کو قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے، تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا، قریب قریب یہی طرز عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوت حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا۔ نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تصور، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالب حق ہو چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر یا معذور ہو۔ اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہے اس لیے آپؐ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپؐ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبول حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپؐ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپؐ اسے ان مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپؐ کی نہیں بلکہ آپؐ کو ان کی ضرورت ہے۔

فرمایا گیا ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ (عبس: ۱ تا ۱۰)

"ترش رُو ہوا اور بے رُخی برتی، اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پرواہی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو تمہارے پاس خود دوڑ کر آتا ہے اور وہ خدا سے ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔"

یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ابن اُمّ کلثومؓ کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپؐ کو بتایا کہ داعی حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالب حق ہے وہ اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے! اور دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اسے راہِ راست

ؔ تفہیم القرآن

بتائی جائے، ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے، پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اس کی طرف اسے توجہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے اور اس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی تو خواہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سدھرنا چاہے تو نہ سدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ کرو، خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر پھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو، نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے۔ اس کے سامنے اسے بالحاح پیش کیا جائے، اور نہ تمہاری یہ نشانی ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو۔ جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمہاری کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پا سکے گی۔ ورنہ ناکام ہو جائے گی حق ان سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

اسی مضمون کو سورہ الاعلیٰ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝

"اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔"

عام طور پر مفسّرین نے ان دونوں فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے، پہلے فقرے کا مطلب انہوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمہیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے۔ اور دوسرے فقرے کا مطلب یہ لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے اور بعد کے فقرے کا مضمون دوسرے فقرے کے مضمون پر مرتب ہوتا ہے، اس لیے ہم اس ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبی، ہم تبلیغِ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسّر کیے دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے، اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون تیار نہیں ہے یہ اس لیے ہے کہ اس کا پتا تبلیغِ عام ہی سے چل سکتا ہے، اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمہارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہِ راست اختیار کر لیں، یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہیں کی تعلیم و تربیت پر تمہیں پوری توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن کے متعلق تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول کرنا نہیں چاہتے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

قبولیتِ حق اور خداترس انسان

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوتِ دین کو قبول کرنے کی صلاحیت خداترس انسانوں ہی میں ہوتی ہے ناخداترس انسان میں نہیں ہوتی۔ فرمایا:

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى (الاعلیٰ : ۱۰)

"جو شخص ڈرتا ہے وہی نصیحت قبول کرے گا"

یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہوگا، اس کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے پر نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سُنے گا جو اسے ہدایت اور گمراہی فلاح وسعادت کا راستہ بتا رہا ہو۔

قبولیتِ حق سے عاری لوگ

قرآن نے بتایا ہے کہ جہاں خداترس انسان قبول حق کی استعداد رکھتا ہے وہاں بدبخت اور ناخداترس انسان یہ صلاحیت نہیں رکھتا۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝

(الاعلیٰ : ۱۱، ۱۲)

"اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جانے والا ہے"

اس لیے کہ درحقیقت داعی کے تنبہ سے وہی متنبہ ہوتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرنے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس: ۱۱)

"تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے"

اس کے علاوہ یہ نشانی بھی بتائی گئی ہے کہ ضدی اور متکبر انسان حق قبول کرنے سے معذور ہوتے ہیں:

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

"اُن میں سے اکثر لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔"

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے اور جنہوں نے طے کر لیا تھا کہ آپؐ کی بات بہرحال مان کر نہیں دینی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "یہ لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لیے یہ ایمان نہیں لاتے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت ہو جانے پر انکار حق اور دشمنی کی روش اختیار کیے چلے جاتے ہیں، ان پر خود ان کی اپنی شامتِ اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انہیں توفیقِ ایمان نصیب نہیں ہوتی اسی مضمون کو آگے چل کر اس فقرے میں کھولا گیا ہے کہ "تم تو اس شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے۔" ایسے لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مثال دی گئی ہے فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ (یٰسٓ : ۸)

"ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں، اس لیے وہ سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔"

یہاں "طوق" سے مراد ان کی ہٹ دھرمی ہے جو ان کے لیے قبول حق میں

۱؎ تفہیم القرآن

مانع ہو رہی تھی "ٹھوڑیوں تک جکڑے جانے" اور "سر اٹھائے کھڑے ہونے سے" مراد وہ گردن کی اکڑ ہے جو تکبر اور نخوت کا نتیجہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے، کہ ہم نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ان کی گردن کا طوق بنا دیا ہے، اور جس کبر و نخوت میں یہ مبتلا ہیں، اس کی وجہ سے ان کی گردنیں اس طرح اکڑ گئی ہیں کہ اب خواہ کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آجائے تو یہ اس کی طرف التفات کر کے نہ دیں گے :

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ (یٰسین : ۹)

"ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے، اور ایک دیوار ان کے پیچھے، ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے، اب انہیں کچھ نہیں سوجھتا"

ایک دیوار آگے اور ایک دیوار پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اس ہٹ دھرمی اور استکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے کوئی سبق لیتے ہیں اور نہ مستقبل کے نتائج پر غور کرتے ہیں، ان کے تعصبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے ہیں کہ انہیں وہ کھلے کھلے حقائق بھی نظر نہیں آتے جو ہر سلیم الطبع انسان کو نظر آرہے ہیں :

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (یٰسٓ : ۱۰)

"ان کے لیے یکساں ہے، تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حالت میں تبلیغ کرنا بے کار ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تبلیغ عام ہر طرح کے انسانوں تک پہنچتی ہے، ان میں سے کچھ لوگ

۱؎ تفہیم القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے پہلی قسم کے لوگوں سے جب سابقہ پیش آئے اور تم دیکھ لو کہ وہ انکار و استکبار اور مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں تو ان کے پیچھے نہ پڑو، مگر ان کی اس روش سے دل شکستہ و مایوس ہو کر اپنا کام چھوڑ بھی نہ بیٹھو، کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ اسی ہجوم خلق کے درمیان وہ خدا کے بندے کہاں ہیں جو نصیحت قبول کرنے والے اور خدا سے ڈر کر راہ راست پر آجانے والے ہیں، تمہاری تبلیغ کا اصل مقصود اسی دوسری قسم کے انسانوں کو تلاش کرنا اور انہیں چھانٹ چھانٹ نکال لینا ہے، ہٹ دھرموں کو چھوڑتے جاؤ، اور قیمتی متاع کو سمیٹتے چلے جاؤ۔

ہٹ دھرم لوگوں سے اجتناب

ایسے بے ہودہ لوگوں سے مناظرہ سے منع کیا گیا ہے، جو حق کے متلاشی نہیں بلکہ فتنہ جُو ہوں فرمایا:

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (الانعام: ۶۸، ۶۹)

"اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پہ نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس

ا۔ تفہیم القرآن

ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو، ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے، شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں“

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدائی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کرلیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کرکے ضرور انہیں قائل کرکے ہی چھوڑیں گے اور ان کے ہر لغو و مہمل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنہیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہوں انہیں نصیحت کریں اور حق بات اُن کے سامنے پیش کردیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اُتر آئیں تو اہل حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیئے، جو خود طالب حق ہوں۔

دعوت براہ راست دی جائے

حکمت تبلیغ یہ ہے کہ مخالفین کی بے ہودگیوں کو قطعی نظر انداز کرکے جو بات کہنی ہو وہ کہی جائے۔ چنانچہ سورہ حٰمٓ السجدہ کے نزول کے پس منظر میں جو واقعہ پیش آیا تھا اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم سیرت نگار محمدؒ بن اسحاق نے مشہور تابعی محمدؒ بن کعب القرظی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے دوسرے گوشہ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت

میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے اس موقعہ پر عتبہ بن ربیعہ (ابوسفیان کے خسر) نے سرداران قریش سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں۔ اور ہم بھی اسے قبول کر لیں۔ اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں، سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ اور عقبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا، آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا بھتیجے، تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہے، مگر تم اپنی قوم پر ایک مصیبت لے آئے ہو تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے، تم نے ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا ہے، قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی بُرائی کرتے ہو اور ایسی باتیں کرنے لگے ہو جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو میں کچھ تجویزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں ان پر غور کرو۔ شاید کہ تم ان میں سے کسی کو قبول کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوالولید آپ کہیں میں سنوں گا۔ اس نے کہا بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے، تو ہم سب تم کو اِل کر اتنا کچھ دے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سے سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ گے۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔"

عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سُنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ابوالولید آپ کو جو کہنا تھا کہہ چکے؟ اس نے کہا ہاں۔" آپ نے فرمایا اچھا، اب میری سنو، اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۃ السجدہ کی تلاوت

شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: "اے ابوالولید، میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

عتبہ کی اس گفت گو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اس میں ان بے ہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ سے کہی تھیں، اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپؐ کی عقل پر حملہ تھا۔ اس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کے نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہرحال کوئی امکان نہیں ہے۔ اب لامحالہ آپؐ کی دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر معاذ اللہ آپؐ کی عقل میں فتور آ گیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپؐ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپؐ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس طرح کی بے ہودگیوں پر جب مخالفین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کو جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ان کو قطعی نظرانداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو وہ کہے۔

چنانچہ اس سورہ میں یہی طرز اختیار کیا گیا ہے، عتبہ کی باتوں سے صرف نظر کر کے اس سورہ میں اس مخالفت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو قرآن مجید کی دعوت کو روک دینے کے لیے کفار مکہ کی طرف سے اس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بداخلاقی کے ساتھ کی جا رہی تھی۔

دعوتِ حق کی مزاحمت پر داعی تنگ دل نہ ہو

اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ

مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (شوریٰ : ۸)

"اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔"[1]

اس سے مقصود نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تعلیم اور تسلّی دینا ہے اس میں حضور نبیّ اکرم کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ آپؐ کفّارِ مکّہ کی جہالت و ضلالت اور راوپر سے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ دیکھ کر اس قدر نہ کڑھیں، اللہ کی مرضی یہی ہے کہ انسانوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہدایت چاہے اسے ہدایت ملے اور جو گمراہ ہونا پسند کرے، اسے گمراہ ہونے دیا جائے، جدھر کوئی جانا چاہتا ہے جائے، اگر یہ اللہ کی مصلحت نہ ہوتی تو انبیاء اور کتابیں بھیجنے کی حاجت ہی کیا تھی، اس کے لیے تو اللہ جلّ شانہ کا ایک تخلیقی اشارہ کافی تھا سارے انسان اسی طرح مطیع فرمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی پتھر اور سب حیوانات ہیں، یہ مضمون دوسرے مقامات پر بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ انعام آیت ۳۵ :

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

"پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس کی خبریں تمہیں پہنچ چکی ہیں تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس

---

[1] تفہیم القرآن

کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو، اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہٰذا نادان مت بنو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ درستی پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جاتی جس سے ان کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپؐ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو، جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں، اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیت صالح کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے، تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرنا ہی ضروری ہے تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے۔ کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ہمیں اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلے میں جدوجہد کرانے اور دعوتِ حق کی تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارہ سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکر سے

کام لے کر حق کو پہچان لیں کہ وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہترین اصول زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جدّوجہد کر کے فکری ارتقا کی راہ سے اقامت دین حق کی منزل تک پہنچیں، اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق پائیں گے وہ مدد بھی انہیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے افکار فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکر صالح پھیلا دے اور تمدّن فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیت صالح کی تعمیر کر دے تو تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اسے تصرفات کے اختیارات دیئے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلہ کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ اس تدریجی عمل کی پابندی خدائی قانون ہے۔ اس سلسلے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(الانعام : ۳۷)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ کہو اللہ نشانی اُتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔"

نشانی سے مراد محسوس معجزہ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے

کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں سمجھتے۔

چنانچہ آیت ۱۰۷ سورہ الانعام میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ۝

(الانعام: ۱۰۶، ۱۰۷)

"اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے۔ کوتوال نہیں بنایا گیا، تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر اس حق کو کوئی قبول نہیں کرتا تو نہ کرے، تم کو نہ اس کام پہ مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری و جوابدہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے، لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے۔ اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے۔ تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ

---

[1] تفہیم القرآن

انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جاتے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھادی گئی ہے اُس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو، جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں۔ ان کے پیچھے نہ پڑو جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں۔ اس کی طرف جانے کے لیے انہیں چھوڑ دو۔

اصلاح کی سُست رفتاری پر مایوسی سے اجتناب

یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ داعی کو اصلاح کی سُست رفتاری پر مایوسی نہیں ہونی چاہیے اور نہ اصلاح کے لیے بے جا راستہ اختیار کرنا چاہیے فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

"اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا۔ مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔"

اس آیت کا ایک مقصد تو وہ تھا جو عنوان بالا میں بیان ہوا۔ دوسرا مقصد اہل ایمان کو ان مشکلات کی حقیقت سمجھانا ہے جو تبلیغ دین اور اصلاح خلق کی راہ میں اکثر پیش آتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی آزادیٔ انتخاب و ارادہ اور اس کی بنا پر طبائع اور طریقوں کے اختلاف کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ کبھی تو کارِ اصلاح

کی سست رفتاری کو دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کرامتیں اور معجزات رونما ہوں تاکہ انہیں دیکھتے ہی لوگوں کے دل بدل جائیں اور کبھی وہ ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لے کر اصلاح کے بے جا طریقے اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں کرامتوں اور معجزات کا جواب تو سورہ الرعد آیت ۳۱ میں اس طرح دیا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى۔

"اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟"

اس آیت مبارکہ کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی لازمی ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفار کی طرف سے بار بار نشانیوں کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو کوئی نشانی دکھائی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں دل سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبول حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابہ کرام کے انقلاب حیات میں، نور حق نظر نہ آیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پالیں گے؟

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ

(”اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے، بلکہ سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

یعنی نشانیوں کے نہ دکھانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دکھانے پر قادر نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان طریقوں سے کام لینا اللہ کی مصلحت کے خلاف ہے اس لیے کہ اصل مقصد تو ہدایت ہے نہ کہ ایک نبی کی نبوّت کو منوا لینا اور ہدایت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کی فکر و بصیرت کی اصلاح ہو:

اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَھَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا۔

”پھر کیا اہل ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہوں گے کہ اللہ اگر چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟“

یعنی اگر سمجھ بوجھ کے بغیر محض ایک غیر شعوری ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے نشانیاں دکھانے کے تکلّف کی کیا حاجت تھی یہ کام تو اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ سارے انسانوں کو مومن ہی پیدا کر دیتا۔

غیر اخلاقی طریقوں کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورہ النحل آیت ۹۰ میں تین چیزوں کا حکم دیا ہے اور اُن کے مقابلے میں تین چیزوں سے منع کیا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○

”اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔“

جو چیزیں منع کی ہیں ان میں آخری اور تیسری البغی یعنی ظلم و زیادتی ہے البغی کے معنیٰ ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

اور آیت نمبر ۹۱ میں علی الترتیب تین قسم کے معاہدوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

اور آیت نمبر ۹۲ میں عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ موجب فساد ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ

"تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو۔ تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔"

یہاں خصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر موجب فساد ہے اور جسے بڑے بڑے اونچے درجے کے لوگ بھی کار ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داد پاتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں کی سیاسی، معاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کا لیڈر ایک وقت میں دوسری قوم سے معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد کی خاطر یا تو اسے اعلانیہ توڑ دیتا ہے یا درپردہ اس کی خلاف ورزی کر کے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ تک کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راست باز ہوتے ہیں۔ ان حرکتوں پر صرف یہی نہیں کہ ان کی پوری

قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اُٹھتی، بلکہ ہر طرف سے ان کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس طرح کی چالبازیوں کو ڈپلومیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر متنبہ فرماتا ہے کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرنے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوں گے وہ اللہ کی عدالت میں مواخذہ سے نہ بچ سکیں گے۔

"اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا"

یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمہارے درمیان کشمکش برپا ہے ان میں برسرِ حق کون ہے اور برسرِ باطل کون۔ لیکن بہرحال خواہ کوئی سراسر حق پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہوگا، کیونکہ حق پرستی صرف نظریے اور عقیدے ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی، طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے یہ بات خصوصیت کے ساتھ ان مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ چونکہ ہم خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا فریق مقابل خدائی باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو زک پہنچائیں۔ ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفاء عہد کا لحاظ رکھیں، ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ مشرکین عرب کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے ان سے ہر طرح کی خیانت کی جا سکتی ہے۔ جس چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو زک پہنچے وہ بالکل روا ہے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔

"اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔"

یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرفدار سمجھ کر بھلے اور بُرے ہر طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے . . . . اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلافات کا اختیار چھین لیا جاتے اور چار و ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کے پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ کو اپنے نام نہاد طرفداروں کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا وہ سب کو مومن و فرمانبردار پیدا کر دیتا۔ کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟

وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط

"مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے۔ اس لیے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں۔ کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے، اور کوئی راہ راست کا طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرماتا ہے:

وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

"اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی۔"

یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمہاری بداخلاقی

دیکھ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہو ان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو:

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (النحل: ۹۴)

"(اے مسلمانوں) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، بُرا نتیجہ دیکھو اور سزا بھگتو۔"

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ (الشوریٰ: ۱۵)

"چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لیے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو۔"

یعنی ان کو راضی کرنے کے لیے اس دین کے اندر کوئی رد و بدل کا راستہ نہ نکالو کہ وہ اسلام میں آجائیں، جس کو ماننا ہے، خدا کے اصلی اور خالص دین کو جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جہنم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے، خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

داعیِ حق ہر عصبیت سے پاک

داعیِ حق کو ہر قسم کی عصبیت سے پاک ہونا چاہیے نہ خود کسی نوعیت کی عصبیت

یا تفرقہ بازی میں مبتلا ہو اور نہ دوسروں کو مبتلا ہونے دے فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ: ۱۵)

"اور ان سے کہہ دو کہ" اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں"

اس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق، جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرے قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمہارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے، اس میں اپنے یا غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں رہیں، بلکہ جو حق ہے وہ سب کے لیے حق ہے جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے اور جو جرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی استثنا نہیں ہے۔

ضدّی مخاطب سے عدم التفات

حکیمانہ تبلیغ کے باوجود اگر مخاطب اپنی بات پر بضد ہو تو اسے اپنے حال پر

چھوڑ دیا جائے فرمایا:

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝ (الزخرف : ۸۳)

"اچھا تو پھر اُنہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔"

اس کے لیے کہ آخر اللہ کی فرماں برداری کے سوال پر جھگڑا کرنے سے کیا حاصل ہے فرمایا:

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (البقرہ:۱۳۹)

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے۔"

یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں۔ کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے، اور اسی کی فرمانبرداری ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے بھی، تو وہ ہمارے لیے ہے۔ نہ کہ تمہارے لیے، کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کا مستحق تم ٹھہرا رہے ہو، نہ کہ ہم "اَتُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ" کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا تمہارا یہ جھگڑا نفسانی نہیں ہے بلکہ خدا واسطے کا ہے۔ تو یہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے:

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ

(البقرہ : ۱۳۹)

"ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں۔ تمہارے اعمال تمہارے لیے اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔"

گویا تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرا کر

ان کی پرستش اور اطاعت بجالاتے ہو تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ اس کا انجام تم خود دیکھ لوگے۔ ہم تمہیں زبردستی نہیں چاہتے لیکن ہم نے اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ کے لیے خالص کر دیا ہے۔ اگر تم تسلیم کر لو۔ کہ ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جاتے گا۔ یہی مضمون قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ فرمایا:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي
وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ○ (ہود : ۳۵)

"اے محمدؐ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟
ان سے کہو اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمّہ داری ہے
اور جو جرم تم کر رہے ہو اس کی ذمّہ داری سے میں بری ہوں"

انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوح علیہ السلام کا یہ قصہ سنتے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہو گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قصے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتے ہیں کہ انہیں ہم پر چسپاں کریں۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہ راست نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے لیے ایک قصہ گھڑتے ہیں اور اس طرح "در حدیث دیگراں" کے اندر میں ہم پر چوٹ کرتے ہیں۔ لہٰذا سلسلہ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے بُرے پہلو کی طرف جایا کرتا ہے اور اچھائی سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پہلو پر ان کی نظر جا سکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے، یا وہ تمہیں کوئی مفید سبق دے رہا ہے۔ یا تمہاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے تو اس سے فائدہ اُٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو۔ مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں بُرائی کا کوئی ایسا پہلو تلاش کرے گا جس سے حکمت اور نصیحت پر پانی پھیر دے اور نہ صرف خود اپنی بُرائی پر قائم رہے بلکہ سائل کے ذمّے بھی اُلٹے کچھ بُرائی لگا دے۔

بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جا سکتی ہے اگر سننے والا اسے خیر خواہی کے بجائے چوٹ کے معنی میں لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس و ادراک کے بجائے بُرا ماننے کی طرف چل پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی فکر کی بنا پر ایک بنیاد بدگمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقتِ واقعی ہونے اور ایک بناوٹی داستان ہونے کا یکساں امکان ہو مگر وہ ٹھیک تمہارے حال پر چسپاں ہو رہی ہو۔ اور اس میں تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی ہوتی ہو تو تم ایک دانش مند آدمی ہو گے اگر اسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اُٹھاؤ گے۔ اور محض ایک بدگمان و کج نظر آدمی ہو گے۔ اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگا دو گے کہ قائل نے محض ہم پر چسپاں کرنے کے لیے یہ قصّہ تصنیف کر لیا ہے اسی بنا پر فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے تو اپنے جرم کا میں ذمّہ دار ہوں لیکن جس جرم کا تم ارتکاب کر رہے ہو وہ اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمّہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ۝

(القصص : ۵۵)

"اور جب انہوں نے بے ہودہ بات سُنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں۔ اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

اس آیت میں اس بیہودہ بات کی طرف اشارہ ہے۔ جو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے حبشی عیسائیوں کے اس وفد سے کی۔ جس کا ذکر ابن ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ کہ ہجرت حبشہ کے بعد نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے بیس کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد

تحقیق حال کے لیے مکہ معظمہ آیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے، وفد کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کیے۔ جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے جب مجلس برخاست ہوئی۔ تو ابو جہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا۔ اور انہیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا" اس پر انہوں نے جواب دیا کہ "سلام ہے۔ بھائیو تم کو ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔"

حکمت تبلیغ کا ایک اور نمونہ سورہ الشوریٰ کی آیت ۱۰ میں ملتا ہے جس میں اہل کتاب کو قرآن کی دعوت اسلامی دی گئی ہے۔ فرمایا:

اہل کتاب کو قرآن کی دعوتِ اسلامی یوں دی گئی ہے:

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ
وَقُلْ لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ أَأَسْلَمْتُمْ ط
فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ
الْبَلٰغُ ط وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝ (آل عمران: ۲۰)

لہ سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۳۲ - البدایہ والنہایہ

"اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں۔ تو ان سے کہو" میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھ لو" کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کر لی ہے"؟ اگر کی تو وہ راہِ راست پا گئے۔ اور اگر اس نے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے"

کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی، دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ میں اور میرے پیرو تو اس ٹھیٹھ اسلام کے قائل ہو چکے ہیں جو خدا کا اصل دین ہے، اب تم بتاؤ کہ کیا تم اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوتے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو۔

تبلیغ دین اور مباہلہ

تبلیغ کے مختلف مراحل میں ایک مرحلہ مباہلہ کا بھی آجاتا ہے

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ (آل عمران: ۶۱)

"یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دُعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو"

یہ علم آجانے کے بعد، یعنی وفد جو نصاریٰ نجران کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث اور مناظرہ کے لیے آیا تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

سے تین نکات پر بحث کی اور آپؐ نے جو دلائل دیے ان کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ نکات حسب ذیل تھے ان میں پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی، یہ تھی کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی وجہ بھی ان سے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے دینی مصلحتوں کے تحت منصب نبوّت پر فائز کیا اور اسے ایسے معجزے عطا کیے جو نبوّت کی صریح علامت ہوں اور منکرین حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دیا بلکہ اس کو اپنے پاس اٹھالیا، مالک کو اختیار ہے کہ اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ وہ خود مالک تھا۔ یا مالک کا بیٹا تھا۔ یا ملکیت میں اس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے۔ وہ وہی چیز تھی جس کی طرف محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم دعوت دے رہے ہیں دونوں کے مشن میں یک سرمو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی۔ اور نہ اس مذہب کی پیروی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

لہٰذا اب اس علم کے بعد بھی اگر وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے تو پھر ان کے لیے حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے یہ صورت پیش کریں جس سے مقصود یہ ہے کہ جو تین نکات ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ ان میں سے کسی کا جواب بھی ان کے پاس موجود نہ تھا۔ مسیحیت کے عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امر واقعہ کے

عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو۔ کہ جو جھوٹا ہو۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دُور دُور تک رواں ہے۔ دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انہیں بھی کامل اعتماد نہیں ہے۔

اہل کتاب اور عقیدہ توحید

فرمایا گیا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (آل عمران: ۶۴)

”کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔“

یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے تمہاری اپنی کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

تبلیغ میں قول بلیغ کی اہمیت

فرمایا گیا:

فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَعِظۡهُمۡ وَقُلۡ لَّهُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِیۡغًا (النساء: ۶۳)

"یعنی ان سے تعرض مت کرو، انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے"

یہ منافقین کے طرز عمل کے ذکر کے بعد فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بگڑے ہوئے مسلمانوں کی اصلاح کس طرح کی جائے، انہیں سرزنش کرنے کے بجائے مؤثر طریقہ سے بات کرنا سکھایا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں کو گرویدہ بنانا اور ایسے دل نشین طریقہ سے بات کرنا مقصود ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ڈر اور خوف اور شرمندگی و ندامت سے دُور بھاگیں، وہ اپنی اصلاح کی فکر کریں۔

دعوت دین بذریعہ مکاتیب

یہ بھی ایک طریق دعوت ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بادشاہوں کو بذریعہ خطوط دعوت دی، اور اسلام کی تعلیم دی۔ دعوت کے لیے جس طرح تخاطب، مذاکرے اور گفت گو سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح نشرواشاعت اور خطوط کے ذریعہ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ جب صلح حدیبیہ کے ذریعے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی دعوت وسیع کرنے کے لیے پہلی دفعہ مہلت ملی ملک کے اندر امن میسّر آیا۔ اور ایسے حالات میسّر آئے کہ گردو پیش میں اسلام کی دعوت پھیلائی جائے تو اس کا افتتاح نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایران، روم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور مختلف قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف

بلانے کے لیے پھیل گئے۔

دینِ حق کی تبلیغ فریضۂ منصبی

دینِ حق کی تبلیغ پیشہ وارانہ کام نہیں ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام: ۹۰)

اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔"

یعنی قرآن تو ایک سراسر ذکر ہے۔ اور دُنیا کے ہر فرد کے لیے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ہر آدمی آگے بڑھ بڑھ کر اسے حاصل کرے۔ یہ ایک سراسر نصیحت اور خیر خواہی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت مبلّغ کو بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ اور جن پر تبلیغ کا کام کیا جائے ان کو بھی اسی جذبہ کے تحت اس کا استقبال کرنا چاہیے۔

فروعات سے پہلے اصول پر زور

ہماری دعوت کا اصول اَلْاَقْدَم فَالْاَقْدَم ہونا چاہیے جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی تعرض کرنا چاہیے۔ اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیے اسی طرح جس چیز کی دینی اہمیت جتنی کم ہے اس پر اسی قدر کم توجہ دی جانی چاہیے اور اس کی قدر و قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جُدا جُدا زور دینے کے بجائے اس اصل الاصول کی فکر کرنی چاہیے جس کی اصلاح سے فروع کو اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل کر گر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روکنے کے لیے الگ الگ تدابیر اختیار نہیں

کی جائیں گی۔ بلکہ براہ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی فکر کی جائے گی یا مثلاً کسی شخص کا خون خراب ہو اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو رہے ہوں تو ایک ایک پھوڑے پر نشتر چلانے اور ایک ایک ناسور پر پھایہ رکھنے کی جگہ اصلاح خون کی تدبیر کی جائے گی۔ اس اصول پر ہمارے مبلغین کو مقامی حالات پر غور کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا؟ اور پھر ہر ضرب اسی علت کو دور کرنے کے لیے لگائی جانی چاہیے۔ اس کام کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے۔ اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے۔ ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیے۔ یہ جڑ اگر قائم ہو گئی تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے

جماعت کا پورا لٹریچر اسی اصول پر لکھا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی اُمور پر اُصولوں کے استحکام کے لیے پورا زور استدلال صرف کیا گیا ہے مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے شاخوں کی کٹائی چھنٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قصر حیات کے مٹتے ہوئے نقوشِ زینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں۔ بلکہ اس کی بنیادوں کی فکر کریں ورنہ دیواروں کی خوبصورتی تو ترقی کر جائے گی۔ مگر اس کی تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت کو کھنڈر بنتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے۔ تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور پھر ہر نشتر اصلاح اسی پُرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ آپ لوگ اب اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیے۔ بار بار کے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جزئیات پر حملہ کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس طرز پر کام کرنے سے خواہ مخواہ جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے چبھنے والے القاب مثلاً وہابی اور

بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں حتیٰ کہ سر پھٹول تک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریق پر تبلیغ کو دہرانے سے قطعاً اجتناب کیجیے۔

آپ حضرات غور کریں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو توحید نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے یا عقیدۂ معاد کی ناواقفیت سے، علاوہ بریں کچھ خرابیاں ایسی ہیں جو اصول و فروع دین کی صحیح ترتیب کو اُلٹ دینے سے نمودار ہوتی ہیں۔ خود بگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں اور وہ ہے کتاب و سُنت سے بے تعلقی، یہ سب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا، بلکہ بکثرت علماء تک کتاب و سُنت سے براہ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے اب اگر ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے۔ تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہیے جب تک بنیادی معتقدات کی اصلاح نہیں ہو جاتی۔ لوگوں کو فروعی گمراہیوں کو صبر سے گوارا کرنا پڑے گا میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فروعات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ ہرگز نہ زور دیا جائے۔

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے۔ جو شرارت اور خبث کی بنا پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام بچارے محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوتے ہیں۔ مدت ہائے دراز کی غلط تعلیم و تربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اُتر گئی ہے کہ جن طور و طریقوں کو وہ اختیار کیے ہوتے ہیں۔ انہی کا نام دین ہے۔ ان بیچاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صبر و تحمل اور تدریج سے توحید، نبوت اور معاد کے اسلامی تصورات کو ان کے ذہنوں میں راسخ کیا جائے۔ ان کے عقائد کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف وہابی وہابی پکار کر بھیڑ جمع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلاب عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوی کی صداقت اچھی طرح واضح

ہو جائے گی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے روک رکاوٹ کرنے والوں میں بالکل مختصر سا گروہ ایسا تھا جو ذاتی اغراض کی بنا پر مخالفت کر رہا تھا۔ باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے۔ پھر جب تحریک پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آگیا تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لیے انکار کے راستے مسدود ہو گئے۔ ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اغراض کی بنا پر لڑ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ میدان میں ہم تنہا رہ گئے ہیں اس لیے وہ سر جھکا دینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی دعوت حق کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔ اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عُریاں کر دیں۔ تو ان میں سے نیک نیت، فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے کبُرا۔ کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملیں گے۔ پھر جو لوگ غرض کی بنا پر سد راہ بنے ہوئے ہیں وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری چلتی ہوئی گاڑی ان کے روکے نہ رُک سکے گی۔ یہ پروگرام اگر اختیار کرنا ہو تو پھر "آمین بالجہر" اور "تیجے اور قل" کے جھگڑے ختم کیجیے، غور تو کیجیے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لیے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصبُ العین بس اتنا ہی کچھ تھا؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ ان مہمات امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی۔ جن کے لیے ہر دور میں انبیا علیہم السلام مخالفین کے مظالم کا تختہ مشق بنتے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھا دی گئی ہے۔ اقامت دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ فکر تو اس کی کیجیے کہ لوگ خدا کے دین کو برضا و رغبت تسلیم کریں اور سُنّت نبویہ کا اتّباع کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ چیز پیدا ہو گئی تو پھر جس کو جو چیز کتاب و سُنّت سے ثابت ہوتی نظر آئے گی وہ اسے اختیار کرے گا اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہ ملے گا، اسے ترک کر دے گا۔ زور تو ابھی ایک بنیادی اصلاح پر دینا چاہیے۔ اصول سے فروع کی طرف لے چلنے کی جو تدریج

اسوۂ نبوی میں پائی جاتی ہے اگر اسے نظر انداز کر کے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کر دیا جائے تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہو گا۔ اُسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتّباع نہ ہو گا۔

دورِ اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم خرابیاں نہیں تھیں جتنی آج ہمارے دَور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت چوٹ لگائی گئی تھی ؟ کیا اصلاح کی وادی کو ایک ہی جست میں طے کر ڈالا گیا تھا ؟ نہیں بلکہ اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی۔ پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو دھونے کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتّباع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار کو خوب سمجھ لیجیے۔ اور پھر آگے قدم بڑھائیے۔ (روداد جماعت اسلامی حصّہ دوم ص ۷۳ تا ۷۹)

ہم کسی کے حریف نہیں

اپنے طرزِ عمل اور اپنے اندازِ گفتار سے دوسری جماعتوں پر یہ واضح کر دیجیے کہ ہم کسی سے جماعتی کشمکش نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے۔ اور ہمارا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ جو بھی حق سے منحرف ہے ہم بس اس کی غلطی کو صاف بتا دیں گے۔ اس کے بعد ہمارا خاص طور پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہو گا۔ بہرحال کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ آپ اس کے حریف بن کر اُٹھے ہیں، ہمیں تو صرف نظامِ کفر و جاہلیّت کا حریف بن کر رہنا ہے۔ اسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہو گی۔ اُسی تناسب سے ہماری اس کی دشمنی میں بھی شدّت ہو گی۔ (روداد جماعت اسلامی حصّہ دوم ص ۷۹ تا ۸۰)

جو کچھ آپ کریں حکمت کے ساتھ کریں۔ اس کے بغیر آپ کام بنانے کے بجائے اُلٹا بگاڑ دیں گے ہر شخص کو اپنے ہی طبقے اور حلقے کے لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنی

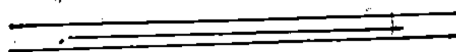
چاہیے۔ کیونکہ وہ اسی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اگر کالج سے نکلا ہوا کوئی نوجوان اس دعوت کو لے کر علماء کے پاس جائے گا تو اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہو گا کہ وہ اپنے اور جماعت اسلامی کے اُوپر کچھ اور فتوے صادر کرانے کا موجب بنے گا اسی طرح سے اگر کوئی قدیم طرز کا عالم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تبلیغ کرنے کی کوشش کرے گا تو اغلب یہ ہے کہ وہ وہاں کے طلباء کو دین سے اور دُور بھگانے کے سوا کوئی خدمت انجام نہ دے سکے۔ ہر شخص کو اسی حلقے میں جانا چاہیے جس سے اس کا تعلق ہے اور جس کے لیے وہ موزوں ہے۔ جو کارکن دیہاتی لوگوں سے بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ دیہات میں جائیں۔ جو مزدوروں کو اپنی بات سمجھانے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ وہ مزدوروں میں کام کریں۔ اس کام کرنے والوں کو اپنے اندر حکیم اور ڈاکٹر کی سی خصوصیات پرورش کرنی چاہئیں۔ وہ پہلے مخاطب کے خیالات اور ذہنی و فکری پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اسی کے مطابق اس سے بات کریں، مطالعہ کے لیے بھی ہر شخص کو وہ چیز دی جائے جو اس کے مناسب حال ہو۔

بحث و مناظرہ اور ردّ و کد اور لڑائی جھگڑے سے ہر حال میں پرہیز کیجیے۔ اس سے کوئی اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ نمایاں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی آپ کو بحث و مناظرہ میں اُلجھانا بھی چاہے تو آپ اس سے نہ اُلجھیں۔ اگر آپ یہ محسوس کریں کہ ایک شخص پر بحث کا موڈ طاری ہو گیا ہے تو اس وقت اسے چھوڑ دیجیے اور کسی دوسرے وقت جب وہ ٹھنڈے طریق سے بات سمجھنے سمجھانے کے لیے تیار ہو اس سے بات کیجیے اور جس شخص میں آپ جھگڑالوپن یا مخالفانہ تعصّب یا ضد کی بیماری پائیں، اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ ہر شخص کو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری بہرحال آپ پر نہیں ہے۔ اپنی توجہ خدا کے ان بندوں پر صرف کیجیے جو حق بات کو سننے کے لیے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

(مشرقی پاکستان کے حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر صفحہ ۳۳ تا ۴۳)

مخالفت میں طرزِ عمل

سخت سے سخت بیہودہ مخالفت کے جواب میں بھی آپ حدود اللہ سے کبھی تجاوز نہ کریں ہر لفظ جو آپ کی زبان یا قلم سے نکلے اس پر خوب سوچ لیں کہ وہ حق کے خلاف تو نہیں ہے اور آپ اس کا حساب خدا کے آگے دے سکیں گے؟ آپ کے مخالفین خدا سے ڈریں چاہے نہ ڈریں، آپ کو بہرحال اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔



داعیِ حق اور اُس کے اوصاف

ابتدائیہ

داعیٔ حق خدا کی زمین پر سب سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتا ہے اس لیے وہ کائنات کی حقیقت کو جانتا ہے اور اس سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کرنے کی طرف انسانوں کو بلاتا ہے۔ دعوتِ حق کو پھیلانے کے لیے اس کی پیدا کردہ تحریکِ اسلامی دعوتِ اسلامی کی علمبردار ہوتی ہے اور ایک داعی جو حق کی طرف دعوت دے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف ہی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک خالق، مالک، آقا اور پروردگار ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی اور پرستش کی جائے اور اس کی مخلوق کا اس کے ساتھ سب سے سچّا اور حقیقی تعلق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مالک اور خالق کی بندگی اور عبادت کرے اس بات کو خالق و مالک نے خود ہی بیان کیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ○

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی اور عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

چنانچہ انسانی زندگی کے تمام کاموں میں سب سے بڑا اور اہم کام یہی ہے کہ کائنات کے خالق کی اطاعت و عبادت کی جائے اور انسانی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ دُنیا کے لوگوں کو مالک کے آگے جُھک جانے اور اس کی بندگی بجالانے کی دعوت دی جائے۔ بندگیٔ رب کی دعوت دینے والا دنیا والوں میں سب سے زیادہ محترم، معزز اور مقدس گروہ انبیاء کا گروہ تھا جس کے افراد اپنے اپنے دَور اور اپنی اپنی قوموں میں مسلسل اور پیہم آتے رہے اور ایک ہی بات کی طرف سارے انسانوں کو بار بار دعوت دیتے رہے:

۱؎ ابتدائیہ از سید اسعد گیلانی

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

اس طرح انسانوں میں سب سے زیادہ معزز، معتبر، محترم اور مقدس گروہ یہی ہے انبیاء کے کام کا مرکزی نکتہ یہی رہا ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دی جائے اس لیے کہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت بھی یہی ہے کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور انسانوں کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف سب سے بڑی صداقت کا اظہار ہے یہی دعوت انبیاء کے ساتھی یا ان کے راستے پر چلنے والے صالحین بھی اپنے اپنے وقت میں انسانوں کو دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں انسانیت کی ہدایت و رہنمائی اور بھلائی کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی طرف بلایا جائے۔ سائنٹفک دریافتیں مشینوں کی ایجاد، انسانی سہولتوں میں اضافے کا کام، محتاج اور پریشان حال انسانوں کی مدد، تعلیمی اور رفاہی ادارے، خیراتی اور امدادی اسکیمیں، امن کی سلامتی اور لوگوں کی بہبود کے سارے کام دعوتِ دین کے اس کام کے آگے ہیچ و پست اور دوسرے درجے کے کام ہیں خدا کی نظر میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور دُنیا و آخرت میں انسانیت کی بھلائی اور بہبود کا عظیم کام خدا کی بندگی کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت دینا ہے اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بہترین صلاحیت کے لوگ اس کام کو سرانجام دیں اور دُنیا کے مختلف کاموں میں مصروف لوگ خدا کے اس کام میں اپنا اپنا حصہ لگائیں اور اپنا فریضہ بندگی ادا کریں۔ لیکن جس طرح ہر کام کے لیے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اللہ کے بندوں تک اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچانے کے لیے بھی ایک مخصوص صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیاء کی تربیت تو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص ذرائع سے خود کرتا ہے کبھی انفس و آفاق میں آیاتِ الٰہی دکھا کر، کبھی فرعون کے گھر میں پرورش کر کے، پھر بکریاں چرواکر، کبھی کنوئیں اور جیل کے راستے سے تختِ شاہی تک پہنچا کر

اور کبھی غار و ہجرت کے مراحل طے کر کے غلبۂ نظامِ اسلامی تک لے جا کر، لیکن انبیاء کے بعد جس کسی کو بھی دعوت حق کا کام کرنا ہو اسے ایک خاص نوعیت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ایک مخصوص طرز کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ تربیت علمی بھی ہوگی اور عملی بھی۔ اس کے بغیر دعوت دین کا کام احسن طریقے سے سرانجام دینا ممکن نہیں ہے۔ تحریک اسلامی ان دونوں قسم کی صلاحیت کے حامل افراد تیار کرتی ہے۔

علمی صلاحیّت

کوئی شخص جب تک یہی نہ جانتا ہو کہ حق کیا ہے اس کا معیار کیا ہے۔ اس کی شناخت اور اس کی پہچان کیا ہے اس کے خدوخال اور اس کا حدود اربعہ کیا ہے وہ کس چیز سے منع کرتا ہے اور کون سا کام کرنے کا حکم دیتا ہے اس وقت تک اس کے لیے نہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ حق کیا ہے اور نہ دوسروں کو باور کرانا ممکن ہے کہ وہ حق ہی پیش کر رہا ہے حق کے نام پر کوئی اور چیز پیش نہیں کر رہا ہے۔ اس لیے دعوتِ دین کے لیے حق طلبی، حق شناسی، حق آگاہی اور حق پرستی ساری صفات ضروری ہیں جو شخص دعوت دین کا یہ کام کرنا چاہے اسے اپنے اندر کچھ صلاحیتوں کو پیدا اور بیدار کرنا ضروری ہے۔

احساس و شعور کی بیداری

ایک داعئ حق کے لیے پہلے ہی قدم پر یہ احساس و شعور بیدار کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اگر وہ دین کی دعوت لے کر اٹھا ہے تو سب سے پہلے اس دین کو اپنی ذات پر نافذ کرنا چاہیے۔ یہ اس سے اس کے دین کا سب سے پہلا تقاضا ہے۔ اگر وہ دین کے اس مطالبے کو پورا کرنے سے عاری ہے تو جس جس پہلو سے وہ دین کا مطالبہ پورا نہیں کرتا اسی پہلو سے اس کی دعوت کا مخاطب بھی اس کی دعوت کی طرف سے غیر متاثر، بے نیاز اور بے پرواہ رہتا ہے، اس

کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو حق کی ترازو میں تولے اور اس کی کمی بیشی کرنے کی اپنی سی کوشش کرے۔ اپنی طرف دیکھنا، اپنی ذات پر خود گرفت کرنا اور اپنی ذات کو لا کر اپنے ضمیر کے سامنے کھڑا کرنا اور ضمیر کی ترازو میں تولنا دعوتِ حق کا آغاز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص جہاد پر جانے سے پہلے اپنے اسلحہ کی جانچ پڑتال کرے۔ غرض اس کے لیے ایک باشعور اور بیدار ضمیر مطلوب ہے اور بیدار ضمیر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیکی پر خوش ہوتا ہے اور بدی پر آزردہ اور نادم ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بہن فاطمہؓ سے مار پیٹ کا واقعہ ان کے اندر احساس و شعور کی کروٹ کا واقعہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی کمزور بہن جو کبھی اپنے بھائی کے سامنے اُف تک نہ کرتی تھی ایک خالص معاملۂ دین میں ان کے سامنے ڈٹ گئی ہے اور یہ تک کہہ گزری ہے کہ "عمر جو چاہے کر لو لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکالا جا سکتا" تو ان کی بہن کا پُرعزیمت جملہ اور ناقابل شکست رویہ ان کے اندر احساس خیر کی بیداری کا باعث بن گیا۔ ان کے اندر عمر فاروقؓ نے کروٹ لی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کوئی خاص چیز ہے جس نے ان کی بہن کو اتنا قوی کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے بھائی کی پرواہ کرنے سے بھی بے نیاز ہے۔ اپنی بہن کی یہی جراٴت آمیز بات ان کے اندر قبولِ حق کے لیے چنگاری کا کام کر گئی۔ اس کے علاوہ ہر شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنے پانچ نکاتی جائزے کا اہتمام کرے کہ وہ اپنی عمر عزیز کس کام میں صرف کر رہا ہے۔ اپنا علم کس مقصد کے لیے کام میں لا رہا ہے اپنی آمدنی کو کہاں کہاں سے سمیٹ رہا ہے اور اسے کس کس راستے میں صرف کر رہا ہے اور اس کی جسمانی اور ذہنی توانائیاں کس کس جگہ کام آ رہی ہیں اور یہ کہ ان سب چیزوں میں اس کے خدا کا کتنا حصّہ ہے تو یہ جائزہ ہی اس کے اندر اخلاص نیت، خشیّتِ الٰہی اور دین کے لیے کام کرنے کا عزم پیدا کر دے گا اور وہ دین کے داعی کی حیثیت سے

کام کرنے کی خوبی سے آراستہ ہو جائے گا۔

نیت کی درستی

احساس کی بیداری کے بعد اللہ کے دین کے لیے کام کرنے کی نیت اور عزم کا مسئلہ ہے جب تک آدمی نیت کر کے خدا کے کام کی طرف رجوع نہ کرے اس کا دل و دماغ اور اس کی توانائیاں سمت منزل اور ہدف سے محروم رہتی ہیں۔ اسلام میں نیتِ خیر کا مسئلہ عملِ خیر سے پہلے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیت کی خوبی عملِ خیر کو تقویت پہنچاتی ہے اس میں خلوص اور بے لوثی پیدا کرتی ہے اس کام کو بہتر انجام تک پہنچاتی اور انسان میں عزم، حوصلہ اور صبر پیدا کرتی ہے۔ نیت کے بغیر کوئی بھلائی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ایک مومن کو یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اللہ کی بندگی کی دعوت اللہ کے بندوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس کے اللہ کا اس کے ذمہ یہ حق ہے جسے ادا کیے بغیر اس کا فریضۂ بندگی ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ اجتماعی کام ہے جسے سر انجام دیے بغیر انفرادی نیکی میں بھی استحکام اور استقلال پیدا نہیں ہوتا۔ ایک داعی میں یکسوئی کے ساتھ یہ جذبہ شدید ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مالک کے دین کی دعوت اس کے تمام بے خبر اور گم کردہ راہ بندوں تک پہنچاتے گا اور اس میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور قوتیں بہترین انداز میں کھپاتے گا۔ اس راستے میں آنے والی مشکلات سے ہرگز نہیں گھبراتے گا اس لیے کہ مشکلات تو حق کے راستے کا زادِ راہ ہیں۔ مصائب اس راستے کا زادِ سفر ہیں اور مخالفتیں اس راستے کا دستور ہیں۔ غرض داعیٔ حق کی پہچان یہی ہے کہ وہ حق و صداقت کا پیغام لے کر خدا کے بندوں کی طرف جاتا ہے اور اگر ان کی طرف سے مزاحمت، گالی گلوچ، مار پیٹ اور پتھر بھی آئیں تو وہ ان سب کو برداشت کرتا ہوا نتائج کو اپنے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کام سے کسی رکاوٹ کے سبب بھی کبھی باز نہیں آتا۔

علمِ حق و صداقت کا حصول

علمِ حق و صداقت دین اسلام ہے اور اس کے حصول کے دو ہی سرچشمے ہیں قرآن اور سنت۔ انسانوں کے مالک کی مرضی قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ اس مرضی کو پورا کرنے کا طریقہ اس قرآن کو لانے والے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہمارا مالک ہم سے جو کچھ چاہتا ہے اور کس طرح چاہتا ہے یہ بات ہمیں رسول پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کو جانے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی اس لیے ایک داعیِ حق کے لیے قرآن سے تعلق جوڑے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہی واحد کتابِ صداقت و ہدایت ہے اور اب ساری ہدایت اس کے اندر ہے اس سے باہر ہدایت و صداقت نہیں ہے اور جو شخص ہدایت کا متلاشی اور صداقت کی پیروی کرنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے استفادہ کیے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین پر خدائے بزرگ و برتر کی یہ یہ ایک ہی آواز ہے جس کی پکار پر قدم بڑھائے بغیر انسان فلاح کا راستہ نہیں پا سکتا۔ اس لیے قرآن کا پڑھنا، اس کے مضامین کو سمجھنا اور اس کی ہدایات کو زیادہ علم رکھنے والوں کی مدد سے اپنے اندر جذب کرنا، اسے حفظ کرنا، اسے اپنے سینے میں محفوظ کرنا اور اس کے سانچے میں ڈھل جانے کی کوشش کرنا ضروری ہے، پھر اس قرآن کو لانے والے پاک اور معصوم انسان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی سعی کرنا ہے اس لیے کہ وہی خدا کے مطلوبہ معیار کے کامل نمونہ اور مکمل انسان تھے اور جو شخص خدا کی مرضی کو انسانی کردار میں منعکس دیکھنا چاہتا ہو وہ رسول پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کردار و اخلاق میں ہی دیکھ سکتا ہے اور جو شخص قرآن کو بولتے ہوئے اپنے کانوں سے سننا چاہتا ہو وہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کو سن سکتا ہے۔ غرض حق و صداقت کا سرچشمہ قرآن و سنّت ہی ہیں۔

مطالعہ سیرت صحابہؓ و صالحین

خدا کے احکام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل نمونے کو انسان جس بہترین انسانی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھ سکتا ہے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین ہیں. یہ وہ لوگ ہیں جن کے کردار ہمارے لیے نمونہ ہیں. جنہوں نے اپنی زندگیاں دعوتِ دین اور اشاعتِ حق کے لیے صرف کیں جو صداقت کے پیکر، ہدایت یافتہ اور نیکی کے علمبردار تھے جن کے کردار سے معروف نمایاں ہوتا اور منکر دبتا تھا جن کے خصائل کے آئینے میں ہمیں معروف و منکر کے اہتمام و اجتناب کی بہترین مثال ملتی ہے جو حق کے لیے جہاد کرنے والے، حق کے لیے گھر بار چھوڑنے والے، حق کے لیے زندگیاں لگانے والے اور کھپانے والے اور حق کے لیے اپنی زندگیوں کی ساری مادی متاع لٹانے والے تھے. جن کے عمل سے ہمیں بھلائی کے راستے پر چلنے کے لیے رہنمائی ملتی ہے اور جن کے کام سے ہمیں اپنے کام میں مدد ملتی ہے جنہوں نے حق ہم تک پہنچایا اور جنہوں نے معروف و منکر کو اپنے کردار سے نمایاں کیا تو وہ ہم پر واضح ہوا۔ ان کی خداترسی، خشیت الٰہی، معاملات کی خوبی، عبادات کا انہماک، کردار کی بلندی، اللہ و رسول سے وفاداری اور دین کے لیے، قربانی و ایثار سے ہمارے سامنے درخشاں مثالیں قائم ہوتی ہیں اور جن کے نقشِ قدم پر چل کر ہم نقش ہدایت پاتے ہیں۔ ایک داعی حق کے لیے ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا اور ان کی زندگیوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنانا بے حد ضروری ہے۔

تعلق باللہ

ایک داعی حق کے لیے سب سے مضبوط لنگر اپنے مالک کے ساتھ اس کا گہرا، جاندار، پائیدار اور مضبوط تعلق ہے اس کا یہ احساس کہ وہ جس کا کام کر رہا ہے وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ قضا و قدر کے کارکن اس کے غیبی کارندے اس

کی مدد کر رہے ہیں اس کی پشت پناہی اسے حاصل ہے۔ وہ زندہ و پائندہ حیّ و قیوم، قادر مطلق اور مختار کل ہستی کا کارندہ اور اس سے وابستہ ہے۔ وہ ہستی قدم قدم پر اس کی دستگیری کرتی ہے وہ فرد کے دل میں اس کی پذیرائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے، اندھیرے اور اُجالے میں اس کی نگراں محافظ اور پشت پناہ ہے جس کی قدرت کاملہ سے باہر کوئی پر بھی نہیں ہلا سکتا۔ وہ اس کی زیر لب دُعاؤں کو بھی سنتا اور اس کے دل کے اضطراب کو بھی جانتا ہے وہ ہستی اس کے ساتھ ہے جس پر ایمان لانا ہر ایمان سے مقدم ہے۔ جس سے خوف کھانا ہر خوف سے مقدم ہے جس کی رضا چاہنا دوسرے ہر کسی کی رضا سے مقدم ہے۔ جس کی عبادت میں انہماک دوسرے ہر انہماک سے مقدم ہے جس سے گہرا تعلق ہر دوسرے تعلق سے مقدم ہے وہی ہر دعوت کا مرکز، ہر دوڑ دھوپ کا محور اور ہر ایثار و قربانی کا مقصود ہے اس کی رضا کا حصول ہمارا سرمایۂ زندگی ہے اور اس کی رضا کے لیے ہمارا سب کچھ حاضر اور قربان ہے:

اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

داعیٔ حق میں یہ توانائی ہو کہ وہ اللہ کے لیے ہر محبّت قربان کر سکے اور اس کی راہ میں ہر غصّہ برداشت کر سکے۔ اس کے لیے ہر نقصان گوارہ کرے اور اس کی خاطر ہر نفع ترک کر سکے جو اس کے دشمن ہیں وہ ان کا دشمن ہو جائے اور جو اس کے دوست ہیں وہ ان کا خادم بن جائے۔ اس طرح مالک کی صفات کے ایک ایک پہلو پر غور و فکر کر کے اس سے محبّت بھی کرے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کے مقابلے میں آگ میں گر جانا اسے قبول ہو اور اس کا ذکر اسے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ اس کی بندگی کے لیے وہ نماز پڑھے، اس کو خوش رکھنے کے لیے وہ روزہ رکھے اور اس کی رضا کے لیے وہ اس کی راہ میں خرچ کرے۔ بس اپنے مالک کے ساتھ جب اس کا تعلق درست اور راست ہو جائے تو پھر داعیٔ حق کے رُوحانی کردار کی بنیاد مضبوط

ہو جاتی ہے اور اللہ پر ایمان لانے کے ضروری تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

محبّت رسُول صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے بعد دوسری ہستی جس سے ایک داعیٔ حق کے لیے بے پناہ محبّت جزوِ ایمان ہے وہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اقدس ہے جنہوں نے انسانیت کو دوزخ کے گڑھے سے نکال کر جنّت کے راستے پر ڈالا جنہوں نے انسانوں کو تباہی سے ہٹا کر سلامتی کی طرف رہنمائی کی۔ جنہوں نے اُٹھا کر ہمارے لیے ایمان و اسلام اور رضائے الٰہی کے حصول کے مواقع پیدا کیے، جنہوں نے ہجرت اختیار کر کے ہمارے لیے کفر سے ایمان کی طرف آنے کا راستہ ہموار کیا، جنہوں نے کفر سے ٹکرا کر حق و باطل کا امتیاز نمایاں کیا جو انسانیت کے قائد و سالار اور رحمۃ اللعالمین ہیں جو قیامت کے لیے تمام انسانیت کے مستقل رہنما اور قائد ہیں۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انسانیت کو تہذیب کا درس دیا۔ انسان کو وحشت و درندگی سے شرافت و مدنیت کا سبق دیا۔ جہالت کے اندھیرے سے علم کی روشنی کی طرف رہنمائی کی، جنہوں نے ہمیں بہترین قانونِ عدل عطا فرمایا انسانی مساوات و مواخات دی۔ آقا و غلام کا فرق مٹایا۔ عورت کو بلند درجہ دے کر اسے مرد کا ساتھی اور رفیق بنایا اور ماں کے پاؤں کے نیچے جنّت کا نشان بتایا۔ جنہوں نے چھوٹوں کو بڑوں کا ادب سکھایا اور بڑوں کو چھوٹوں پر مہربانی اور شفقت کی تعلیم دی۔ جن سے بڑھ کر رحیم و کریم انسان نہ ان سے پہلے دنیا میں آیا اور نہ ان کے بعد آئے گا جو سراپا رحمت، سراپا محبّت و شفقت اور مظلوموں، یتیموں، مسکینوں اور پس ماندہ انسانیت کے محافظ و محسن تھے، ہمارا ان سے محبّت کرنا صرف اعترافِ احسان ہی نہیں بلکہ جزوِ ایمان بھی ہے اور جس دل میں ان کی محبّت نہیں ہے اس میں ایمان کی رمق بھی موجود نہیں ہے ایک داعیٔ حق

کے لیے ان کی محبت مشعل راہ اور ان کی پیروی عزیمت و استقامت کا معیار ہے۔

فکرِ آخرت

خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کے ساتھ ہی فکرِ آخرت بھی مومن کا جزوِ ایمان ہے آخرت کو ترجیح دینا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کو سنوارنے کی کوشش کرنا داعیٔ حق کا فرضِ اوّلین ہے وہ دنیا میں مگن لوگوں کو آخرت کی یاد دلاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ حقیقی اور کامل زندگی آخرت میں ہے دنیا اس کے مقابلے میں یوں ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں شبنم ہوتی ہے دنیا تو اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگوں کی آبادی ہے لیکن آخرت میں جاکر دونوں قسم کی آبادیاں الگ الگ ہو جانے والی ہیں۔ بُروں کے لیے دوزخ کی آبادی ہے اور بڑی ہی ہولناک آبادی ہے۔ اور اچھّوں کے لیے جنّت ہے اور وہ بڑی ہی خوشگوار اور دل خوش کُن آبادی ہے آخرت میں جاکر دنیا کی ساری آبادی ان دو آبادیوں میں تقسیم ہو جائے گی اور تقسیم آبادی کا اصول دنیا کی زندگی کا عمل ہوگا۔ انسان نے اس دنیا میں کس طرح زندگی گزاری۔ خدا کا وفادار بندہ بن کر گزاری یا باغی اور سرکش انسان بن کر گزاری۔ اس کی زندگی اطاعت کی تھی یا بغاوت کی زندگی۔ اس بات کا امتحان کہ ایک شخص اپنے حقیقی مالک کو پہچانتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ یہ کام دنیا میں ہی ممکن ہے یہاں مالک حقیقی کی ذات آیات و علامات کے پیرائے میں پنہاں ہے اور اس کی طرف چلنے میں مصائب بھی آتے ہیں اور اس کی طرف جانے میں شیطان کے خوشنما جال بھی رکاوٹ بنتے ہیں۔ آخرت کا احساس تو صرف ضمیر کرتا ہے اور دُنیا کی شیرینیوں کا احساس انسان کا ظاہری رونگٹا رونگٹا کھڑا کرتا ہے یوں انسان کو امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ اس دُنیا میں داعیٔ حق کا کام یہ ہے کہ

یہ حقیقت کو پہچانے اور راہ راست پر خود بھی چلے اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلنے کی دعوت دے۔

آخرت کے احساس کی پرورش کے مختلف اور متعدد ذرائع ہیں جن میں سب سے اہم ذریعہ قرآن کی آیاتِ انذار اور مناظر قیامت کا مطالعہ ہے پھر احادیث میں کتاب الرقاق اور کتاب الفتن کا مطالعہ ہے۔ پھر بزرگوں کے احساس آخرت کو بیدار کرنے والے واقعات و احوال ہیں۔ پھر گاہے گاہے گورِ غریباں میں جاکر آخرت کے مسافروں کے آخری نشانات قبروں کے درمیان کچھ وقت گزارنا ہے۔ پھر کبھی کبھی اسپتال میں جاکر بیماروں سے ملاقاتیں اور ان کے حالات سے آگاہی ہے اس طرح ایک داعیٔ حق آخرت کی فکر رکھنے والوں کے درمیان رہ کر آخرت کا احساس زیادہ سے زیادہ بیدار کر سکتا ہے

کردار کا ایک قرآنی خاکہ

تحریک اسلامی کے داعی کے کردار کا قرآن نے بھی ایک خاکہ پیش کیا ہے کہ ہر مومن بنیادی طور پر مجاہد ہوتا ہے۔ تبلیغ دین کا عمل ایک مسلسل اور پیہم جہادِ اکبر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر مدینہ کی طرف سفر کرتے ہوئے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا تھا کہ ہم جہاد اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹتے ہیں اس لیے کہ نفس کو اللہ کا مطیع فرمان بنا کر رکھنا اور اسے اللہ کی مرضیات کا تابع کرنا بہت بڑا جہاد ہے اور جہاد ہی مومن کی ساری زندگی کا شعار ہے۔

چنانچہ قرآن نے ایک داعیٔ راہ حق کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ سورۂ الفرقان میں اس طرح درج ہے۔

رحمٰن کے اصلی بندے تو وہ ہیں جو :

یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔

"زمین پر نرم چال چلتے ہیں جاہل ان کے منہ آئیں تو سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں"

يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔

"اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں"

إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا۔

"خرچ میں نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بس دونوں کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں"

لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ

"خدا کے سوا کسی اور کو معبود بنا کر نہیں پکارتے"

لَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔

"اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے"

لَا يَزْنُونَ

"زنا نہیں کرتے"

لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ

"جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے"

إِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا

"لغو چیز پر گزر ہو تو شریفانہ گزر جاتے ہیں"

مزید سورۃ المؤمنون میں علامات بتائیں :

هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ

"اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں"

هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ

"زکوٰۃ پر عامل ہوتے ہیں"

هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ

"اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں"

هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ

"اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں"

لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

"لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر"

لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا

"زمین پر اکڑ کر نہ چل"

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ

"اپنی چال معتدل رکھ اور اپنی آواز پست رکھ"

پھر سورۂ توبہ میں مزید خد و خال نمایاں کیے:

اَلتَّائِبُوْنَ	توبہ کرنے والے
اَلْعَابِدُوْنَ	عبادت کرنے والے
اَلْحَامِدُوْنَ	خدا کی حمد کرنے والے
اَلسَّائِحُوْنَ	خدا کی راہ میں سفر کرنے والے
اَلرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ	رکوع و سجود کرنے والے
اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	نیکی کا حکم دینے والے
اَلنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	بدی سے روکنے والے
اَلْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ	حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے

غرض اس طرح قرآن و حدیث کے صفحات میں جا بجا داعیٔ حق مومن کے کردار کی حسین و جمیل جھلکیاں بکھری ہوئی ہیں جنہیں آسانی سے چن چن کر داعیٔ حق کے خوشنما کردار کا ایک عمدہ گلدستہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

عملی تربیت

تحریکِ اسلامی کا علمبردار صرف الفاظ کے طوطا مینا بنانے کے لیے نہیں اُٹھتا بلکہ وہ اصلاحی زندگیوں میں خوش گوار اصلاحی انقلاب برپا کرنے کے لیے جدّوجہد کرتا ہے اس لیے اس کا حقیقی میدان عمل کا میدان ہے وہ انسانی زندگی کی کھیتی میں اپنی اصلاح کے بیج بوتا ہے اور خوشگوار اخلاق و کردار کی فصل اُگاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانیت عملی طور پر فلاح کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ کوئی راہب نہیں ہوتا کہ خاموشی سے غار کا یا گوشہ گیری کا راستہ اختیار کرے وہ کوئی جوگی نہیں ہوتا کہ پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر شانتی کو تلاش کرتا رہے۔ وہ کوئی تارک الدنیا انسان نہیں ہوتا کہ جس دنیا میں اس کے خدا نے اسے امتحان کی خاطر اُتارا ہے اس امتحان گاہ سے خاموشی کے ساتھ کھسک کر ایک کونے میں جا لگے اور ساری زندگی گزار دے وہ تو حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد کا مخاطب ہوتا ہے کہ:

> "تم میں جو کوئی بدی دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ہی اس کی مذمّت کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل ہی میں اس کو مٹانے کی خواہش رکھے کیونکہ یہ ایمان کا کم از کم درجہ ہے جس دل میں بدی سے نفرت نہ ہو اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں"

اس لیے قرآن نے صاف صاف حکم دیا کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران : ۱۰۴)

"تم میں سے ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف

بلاتی ہو، اچھے کام کا حکم دیتی ہو۔ اور بُرے کام سے روکتی ہو اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں۔"

یہ ہدایات تحریکِ اسلامی کے علمبردار کو واضح طور پر میدانِ عمل میں آکر فریضۂ دعوتِ دین ادا کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

اصلاحِ خلق کی عملی جدّوجہد

ایک داعیٔ حق کی تربیت کا پہلا عملی ذریعہ یہ ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دے جس کام کو وہ حق سمجھتا ہے۔ درحقیقت وہ اس وقت تک اپنی دعوت کے فطری نتائج سے دوچار نہیں ہوتا جب تک وہ میدان میں آکر بندگانِ خدا کے سامنے عملی طور پر دعوتِ حق پیش نہ کرے۔ اس اقدام کے ساتھ ہی اسے تعاون کرنے والے دوستی کے ہاتھ بھی ملیں گے جو اس کے رفیق کار ہوں گے اور مزاحمت کرنے والے دستِ عناد سے بھی واسطہ پڑے گا جو اس کا راستہ روکیں گے یوں عملی جدّوجہد کے ساتھ ہی اسے رفاقت کے لطف اور مزاحمت کی اذیّت سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہی دونوں احوال اس کی تربیت کے لیے ضروری ہوں گے دوستوں سے مل کر وہ کام کا نقشہ بنائے گا اور مخالفوں کی مزاحمتوں کے توڑ کی تدابیر سوچے گا اور ان کے مظالم پر صبر کی مشق کرے گا۔ اس طرح اس کے اندر پختہ عزم و ارادہ پرورش پائے گا اور آزمائش کی بھٹی سے گزر کر وہ سونا ہو جائے گا۔

اس جدّوجہد میں اس کے قریبی عزیز اور ہمدرد بھی اس کا راستہ روکیں گے تاکہ وہ اپنے دنیوی مستقبل کو خراب نہ کرے اور اس کے مخالف بھی اس کا راستہ روکیں گے تاکہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو۔ یہ صورتِ حال اس کی تربیت کے لیے ماحول کا ایک عمدہ تربیتی سانچہ فراہم کر دے گی جس میں ڈھل کر وہ ایک کامیاب داعیٔ حق بن جائے گا۔

صحبتِ صالح

داعیٔ حق کی تربیت کا دوسرا عملی ذریعہ صُحبتِ صالح ہے اِسے بُرے لوگوں کی صحبت و رفاقت و اُلفت سے دست کش ہو کر خدا ترس اور نیک لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اختیار کر لینی چاہیے تاکہ اس پر باطل کی ہم نشینی کے ناگوار اثرات نہ پڑیں اور اس میں باطل باتوں اور لغو حرکات کو برداشت کرنے کی عادت نہ پڑے اور اس میں مداہنت پرورش نہ پائے وہ ہم خیال اور نیک لوگوں کی مجلس سے خود بھی مستفید ہوگا اور ان کو بھی حق کی پشت پناہی پر آمادہ کر سکے گا۔ اگر ایک نمازی آدمی بے نماز لوگوں کی مستقل رفاقت اختیار کرے تو وہ ضرور ہی آہستہ آہستہ نمازوں میں کوتاہی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس کے ہمنشین اس کے لیے نماز کو قائم کرنے میں مددگار ہونے کے بجائے کوتاہی کرنے کا باعث بنتے چلے جائیں گے اس لیے ایک داعیٔ حق کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ نیک لوگوں کی مجلس رفاقت ہے نہ کہ بروں کی ہم نشینی۔ جب نیکی ایک جماعت کی صورت اختیار کر کے کام کرتی ہے، اسی صورت میں وہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ویسے بھی اسلام نے مسلمانوں کو نیکی کا حکم دینے والوں کی ایک جماعت بنا کر کام کرنے کا حکم دیا ہے جس طرح کوئلوں کے پاس بیٹھنے والا ان کی سیاہی اور پھولوں کے پاس بیٹھنے والا اُن کی خوشبو اپنے وجود میں سمیٹ لیتا ہے اسی طرح انسانوں پر صحبتِ نیک و بد کا اثر ہوتا ہے۔ نیک لوگوں کے اجتماعات میں شرکت نیکی کرنے کا ذریعہ اور نیکی کی دعوت پھیلانے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نیک لوگ باہم ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ باہمی اصلاح کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ اور یوں ایک ساتھی اگر گرتا نظر آتا ہے تو دوسرا اسے سنبھالتا ہے۔ اور ایک کے پائے استقامت میں اگر لغزش آتی ہے تو دوسرا آگے بڑھ کر اسے تھام لیتا ہے، ایک کے دامن کا دھبہ دوسرا صاف

کردیتا ہے اور اگر دوسرے کا دامن آلودہ ہو تو پہلا اسے پاک کردیتا ہے۔ ایک کی اصلاح دوسرے کی رہنمائی کا باعث بنتی ہے اور ایک اگر اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتا ہے تو دوسرا اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایک کی کوئی بات کسی کو کھٹکتی ہے تو دوسرا حسن و خوبی کے ساتھ اس کو توجہ دلا دیتا ہے اس طرح آہستہ پورا اجتماع باہمی خیر و خوبی کا تبادلہ کر کے حسن و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک داعیٔ حق کسی صحابی یا بزرگ کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس کی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنے کا معمولی اہتمام کرلے تو اس سے بھی تربیت اور کردار کی اصلاح میں بہت مدد ملتی ہے۔

اپنے سے اعلیٰ ساتھیوں پر نظر

تربیت و اصلاحِ کردار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے احباب و رفقاء میں اخلاق و کردار اور دینداری اور تقویٰ میں اپنے سے بہتر ساتھی پر نظر رکھی جائے اور اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک داعیٔ حق کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیوی امور میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے تاکہ دوسروں کی خوشنما دنیا دیکھ کر وہ لالچ اور حسرت میں مبتلا نہ ہو اور وہ دینی امور میں اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے تاکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا موازنہ کر کے وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرے۔ اس کی خوبیوں کو اپنائے اور اپنے آپ کو سنوارنے کی تگ و دو کرے۔ اگر انسان غور سے دیکھے تو صاف دکھائی دے گا کہ چاروں طرف اس کے مختلف ساتھیوں میں اخلاق و کردار کے عمدہ عمدہ پھول کھلے ہوتے ہیں کسی میں خدا ترسی ہے کسی میں خوش خلقی ہے کسی میں خدا کی راہ میں مال صرف کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے کا جذبہ ہے کسی میں عبادات کا شغف ہے کوئی ذکر و اذکار میں منہمک ہے۔ کوئی خلق خدا کی ہمدردی، خیر خواہی اور خدمت خلق میں آگے ہے کوئی شفقت، نرم مزاجی، خوش خلقی اور خوش مزاجی میں منفرد ہے۔ کوئی

راتوں کا زاہد ہے اور کوئی دن کا مجاہد فی سبیل اللہ اور دعوت حق کا سرگرم و سبک رفتار ساتھی ہے۔ ایک داعیٔ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آس پاس بکھری ہوئی ان خوبیوں کو سمیٹ کر اپنے کردار میں جمع کرتا جائے تاکہ وہ خود بھی ان ساری خوبیوں کا ایک دلآویز گلدستہ بن جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام

داعیٔ حق کی تربیت کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ وہ خلق خدا کے اندر بالفعل نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی خوف دلانے والے کے خوف سے نہ دبے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم وہ قوم ہو کہ نیکی کا حکم دو۔ بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلّط کر دے گا یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا جس طرح اس نے بنی اسرائیل پر کی" (ترمذی)

اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مسلمانوں میں خیر کی شمع کو روشن رکھنے اور شر کی ظلمت کو دفع کرنے کا اہتمام جاری رکھنا اشد ضروری ہے۔ اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ایسے لوگوں کا اللہ کے عذاب سے بچ نکلنا سخت مشکل ہے۔

معاشرہ، تربیت و اصلاح کا سانچہ

جب کوئی شخص دعوتِ حق لے کر اٹھتا ہے تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ تنہا وہی معاشرے کی اصلاح کا کام کرتا ہے بلکہ خود معاشرہ بھی اس کے اندر معمولی سی معمولی کمزوری اور لغزش کی نشاندہی کر کے اسے ٹھیک ٹھیک اصلاح و درستی کے معیار مطلوب پر قائم ہونے اور رہنے پر مجبور کر دیتا ہے ایک داعیٔ حق اس بات

کی طرف معاشرے کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جس بات کا وہ خود اہتمام نہ کرتا ہو اور اس خرابی سے وہ کسی دوسرے کو بچا نہیں سکتا جس خرابی سے بچنے کا وہ خود اہتمام نہ کر رہا ہو۔ اس طرح جونہی وہ اپنی دعوت لے کر اُٹھتا ہے ہر طرف سے نگاہِ احتساب اس کے ایک ایک کام اور حرکت پر لگ جاتی ہے اور اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہو تو اسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اس لیے کسی داعی کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ بہت سی خرابیاں اپنے ساتھ لے کر معاشرہ کی اصلاح کے لیے نکل کھڑا ہو۔ معاشرہ اس کے قول و فعل کو یکسو کر کے چھوڑتا ہے یا تو اسے اپنے قول کے مطابق خود بھی ڈھلنا پڑتا ہے یا پھر اسے اپنے قول سے ہی توبہ کرنا پڑتی ہے اس لیے انسانی معاشرہ دعوتِ حق پیش کرنے والے کے لیے خود بھی ایک کسوٹی بن کر اس کی درستی اور راستی کا ضامن بن جاتا ہے۔ کبھی معاشرہ کی تنقید سے اور کبھی اس کی مزاحمت اور آزمائش سے داعیٔ حق اپنے کردار کی ہر کجی کو دور کر لیتا ہے اور بالآخر وہ اپنی قوت کے لیے مخلص اور بے لوث ہو کر رہتا ہے اس طرح داعیٔ حق کے لیے معاشرہ خود ایک تربیتی ماحول اور اصلاح کا سانچہ فراہم کر دیتا ہے۔

نظامِ حق کے غلبہ کی جدّ و جہد

تمام ذرائع تربیت میں داعیٔ حق کی اخلاقی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ وہ اس نظامِ حق کے غلبہ کے لیے عملی طور پر جدّ و جہد کا آغاز کرے جس کی حقانیت کی گواہی وہ اپنے قول و فعل سے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کے علمبردار کی اخلاقی تربیت کے بھی مختلف مدارج ہیں جس طرح حدیث کی رو سے ایمان کے مختلف درجے ہیں اگر منکر کو قوت سے روکنا ایمان کا پہلا درجہ ہے تو منکر کو روکنے والی قوت کی فراہمی یعنی اقامتِ دین کی جد و جہد بھی ایک داعیٔ حق کا پہلا فرض ہے جس سے پہلو تہی کر کے اس کے دوسرے اعمال کی قدر و قیمت

گھٹ جاتی ہے۔ جب تک یہ نیت نہ ہو کہ خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے اور جب تک پیش نظر یہ منزل نہ ہو کہ دین حق کو ساری دنیا پر غالب کرنا ہے اس وقت تک ایک داعیٔ حق کی سیرت کا پورا پورا ظہور نہیں ہوتا۔ اور اس کے سارے گوشے نکھر کر سیرت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ایک داعیٔ حق میں ایمان کے سارے پہلو اور سارے مدارج موجود ہوں اور وہ جس طرح خدا پر ایمان، رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان اور ایمان کے دیگر تمام گوشوں کو ہمہ پہلو مکمل کیے بغیر ایمان کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اسی طرح زبانی ایمان کا اعتراف ہی کافی نہیں بلکہ اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ و رسول کا مطیع فرمان بنا دینا اور ان کے احکام پر سر جھکا کر بلا چون و چرا چل پڑنا بھی اتنا ہی ضروری ہے ورنہ ایمان بلا عمل و کردار تو نفاق کا مظہر بن جاتا ہے۔ ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کا نام ہی حقیقی اسلام ہے یعنی عملی اطاعت کا زندگی کے ہر ہر گوشے میں مظاہرہ کرنا ہی سچّا اسلام ہے پھر یہ مظاہرۂ اطاعت بھی ایسا ہو کہ جس میں احساس و شعور و ضابطہ اور تقاضائے حکم کا پورا پورا التزام و اہتمام موجود ہو جس میں خدا کا خوف صاف جھلکتا ہوا دکھائی دے جس میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کی صورت حقیقی طور پر موجود ہو جس میں مومن اپنے پورے احساسِ ذمّہ داری سے دینِ حق کی پیروی کا اہتمام کرے اور پورے طور پر تابع فرمان الٰہی ہو جائے جو حکم وہاں سے ملے اس پر چل پڑے جس چیز سے روک دیا جائے اس چیز سے رُک جائے کسی معاملے میں اس کی اپنی خواہش اور مرضی کا دخل نہ رہے بلکہ وہ پورے طور پر خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

پھر اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق مرضی الٰہی کا تابع ہو جائے بلکہ اس میں اپنے مالک کے احکام اور اپنے آقا کے ارشادات کے ساتھ مکمل طور پر والہانہ لگاؤ پیدا ہو جائے کہ ان کے خلاف وہ کوئی دوسرا راستہ سوچ

بھی نہ سکے۔ اس میں احکام الٰہی پر چلنے کے لیے والہانہ پن پیدا ہو جاتے جب تک اس کے مالک کا کلمہ بلند نہ ہو اس کے دل میں ایک لگن اور اس کے دماغ میں ایک ہمہ وقت اضطراب موجود رہے وہ خدا کے دشمنوں کے خلاف مسلسل اور پیہم تبلیغ و تلقین سے لے کر جان و مال کی قربانی تک ہمہ تن جدّو جہد میں مشغول رہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں داعیٔ حق کی وہ صفات نمودار ہوتی ہیں جو اس راستے میں مطلوب ہیں۔ پھر وہ کسی کے اُبھارنے اور اکسانے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ خود کار مشین کی طرح اپنے مالک کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کا وجود اللہ کی آیات میں سے ایک آیت بن جاتا ہے۔

کیا خوب کہا تھا ایک بزرگ نے کہ:

”جب میں اپنے مالک کی اطاعت سے ذرا بھی انحراف کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے بیٹے کی گستاخی، اپنی بیوی کی غفلت اور اپنی سواری کی سرکشی میں صاف دیکھ لیتا ہوں“

بلا شبہ تبلیغ دین ایک انسان سازی کا پُر حکمت کام ہے اور اس میں پھوہڑ پن اور بھونڈے طریقے سے کام نہیں کیا جا سکتا جو لوگ انسانی نفسیات کا لحاظ کیے بغیر صرف جبر و تشدد، طعن و تشنیع اور ملامت و نصیحت سے ٹیڑھے دلوں کو سیدھا کرنا چاہتے ہیں وہ بالعموم دلوں کو توڑ دیتے ہیں، لیکن ان کو سیدھا نہیں کر سکتے اس لیے دل کا دروازہ اندر کی طرف ہے اور اسے جب تک گھر کا مکین خود اندر سے نہ کھولے باہر کے کسی جبر سے کھولا نہیں جا سکتا تبلیغ کا کام حکمت کا کام ہے اس کام کو احسن طریقے سے ہی سر انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

”اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت

دیں اور افہام و تفہیم بھی احسن طریقے سے کریں"

البتہ ایک داعیٔ حق کے لیے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ انسانوں کی تربیت کو بگاڑنے والی اور تبلیغ کی تاثیر کو خراب کرنے والی کون سی چیزیں ہیں۔ اگرچہ وہ بہت سی باتیں ہیں لیکن ان میں بے صبری سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ جلد بازی اس سے بھی زیادہ مضر ہے اور سخت کلامی، درشت مزاجی اور تشدّدِ بیان تو سب سے زیادہ مہلک ہیں اس طرح اسے یہ بھی جاننا چاہیے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو دعوت دین سے بے نیاز اور لاپروا ہوتے ہیں اور بالعموم حق کی علمبرداری کے لیے آگے بڑھنے کے لیے نہ تیار ہوتے ہیں اور نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ دین کی علمبرداری کریں۔ یہ دنیا کی محبت میں اندھے لوگ، اقتدار کے نشے سے سرشار لوگ، مفاد پرستی میں مبتلا لوگ، آرام و راحت کے دلدادہ لوگ اور خوفِ آخرت سے بے نیاز لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ حق کے کسی کام کے نہیں ہوتے اور داعیٔ حق کے لیے ان کا وجود کسی درجے میں بھی ممدّ و معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسے یہ بھی جاننا چاہیے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے میں زیادہ آسانی سے دعوت حق کو قبول کر کے اس کے علمبردار بن جاتے اور حق کی پشت پناہی کے لیے اپنا سب کچھ لگانے کے لیے جلد آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سعید فطرت لوگ جو بات چیت سے شریف، خداترس اور بھلے لوگ شمار ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کے عادی لوگ، جو ہر بات کی گہرائی تک پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں حادثات و حوادث سے عبرت پکڑنے والے لوگ، دین کے طالب اور حق کے متلاشی لوگ، آیاتِ الٰہی پر غور کرنے والے لوگ، سچ بولنے والے راست فکر کے عادی، باہمت جری اور بہادر لوگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک داعیٔ حق ان اقسام کے لوگوں میں اپنی دعوت پہنچا کر زیادہ تعداد میں اپنے ساتھی فراہم کر سکتا ہے۔

اگر ان علمی تربیت کے اصولوں کو داخلی اصلاح و تزکیہ کے لیے اور عملی تربیت

کے اصولوں کو خارجی تربیت واصلاح کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ مناسب اخلاقی اور روحانی تربیت حاصل ہو جاتی ہے جس کی مدد سے دین حق کی تبلیغ و تشہیر اور اقامت و سربلندی کا کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب تک کوئی شخص یہ صفات اپنے اندر پیدا نہ کرے وہ تبلیغ کے میدان میں نہیں نکل سکتا۔ یہ تو ایک اصلاحی معیار ہے جو بیان کیا گیا ہے ورنہ تبلیغ کے لیے نکلنا ہر مومن کا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کے لیے ہر شخص اسی صلاحیت کا مکلف ہے جو اسے حاصل ہے اس کی کوشش کو قبول کرنے والا وہ مالک بے حد رحیم و کریم ہے وہ تو اتنا مہربان ہے کہ اس کا جو بندہ اس کی طرف چل کر جاتا ہے وہ اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے اور جو بندہ اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے وہ اس کے درجات، اس کے وہم و گمان سے بھی زیادہ بلند و بالا کر دینے والا آقا و مولیٰ ہے اس کی مہربانیوں اور بندہ نوازیوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔

داعیٔ حق کے اوصاف

داعیٔ حق کی خصوصیّت

قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس میں ایک داعی کی اہم خصوصیات کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

"یعنی اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"

اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے یہ چیز نگاہ میں رکھنی ضروری ہے کہ یہ بات مکہ معظمہ کے حالات میں کہی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے پیرؤوں پر شدید مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ ایسے عالم میں یہ کہنا اور اس بات کا اعلان کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ میں مسلمان ہوں ایسی بات کہنا گویا اپنے اوپر درندوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا ان حالات میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ بہترین قول اس شخص کا ہے جو اللہ کی طرف بُلائے دوسرے الفاظ میں ایک داعی کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی دعوت اللہ کی طرف ہو کوئی دُنیاوی غرض اس کے سامنے نہ ہو، نہ وطنی، نہ قومی، نہ خاندانی اور نہ مادی کوئی دوسرا مقصد اس کے پیش نظر نہ ہونا چاہیے۔ کوئی شخص خالص اللہ کی طرف دعوت دینے بیٹھا ہے تو قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ایسے داعی کی اولین خصوصیات

یہ معلوم ہوتی ہیں کہ اسے اللہ کی توحید کی طرف دعوت دینی چاہیے۔ اس بات کی دعوت دینی چاہیے کہ خدا کے سوا کسی کی بندگی، کسی کی عبادت اور کسی کی پرستش نہ کی جائے۔ خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، خدا کے سوا کسی سے کوئی طمع نہ ہو، صرف خدا ہی کے احکام اور اس کے فرامین کی اطاعت اس کے پیش نظر ہو اسی کے قانون کی پیروی مطلوب ہو۔ آدمی دنیا میں جو کام بھی کرے یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ میں کس کا بندہ ہوں اور کس کے سامنے مجھے جوابدہی کرنی ہے۔ انسان کی تمام کوششوں اور ساری جدوجہد کا مرکز و محور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر اور اس کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ داعیٔ حق عمل صالح کی خوبی سے آراستہ ہو۔ یعنی نیک عمل کرے۔ اس فرمان پر ذرا بھی غور کیا جائے تو پورا مفہوم واضح ہو جائے گا یہ کہ دعوت دینے والے کا اگر اپنا عمل درست نہ ہو تو پھر اس کی دعوت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک انسان جس چیز کی طرف دعوت دے اسے اس کا عملی مجسمہ ہونا چاہیے اس کی اپنی زندگی میں خدا کی نافرمانی کا کوئی شائبہ تک نہ پایا جائے، اس کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں کہ کوئی شخص اس کے دامن پر ایک دھبہ تک نہ دکھا سکے۔ اس کے گرد و پیش کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کے دوست، اس کے عزیز و اقارب سب یہ جانتے ہوں کہ ہمارے درمیان یہ ایک نہایت بلند اور پاکیزہ کردار آدمی ہے۔

یہ تعلیم ہمیں قرآن پاک کے ساتھ سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی قدم قدم پر ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی حیاتِ طیبہ شہادت دیتی ہے کہ جب وہ خدا کی طرف سے دعوتِ حق دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو معاشرہ جس میں آپؐ چالیس سال سے موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان کردار کا شاہد تھا۔ اس معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو آپؐ کی

بلندیِ اخلاق کا قائل نہ ہو اور آپ کے ظاہر و باطن کی زندگی کا معترف نہ ہو۔ جو آپؐ کے جس قدر قریب تھا وہ اتنا ہی آپؐ کا زیادہ معتقد تھا۔ جن افراد سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھُپ نہیں سکتا تھا انہوں نے سب سے پہلے آپؐ کی نبوّت کا اقرار کیا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پندرہ سال سے آپؐ کی زوجیت میں تھیں اور وہ کوئی کمسن عورت نہیں تھیں بلکہ عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی تھیں۔ جس وقت آپؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا اس وقت ان کی عمر پچپن سال تھی۔ ایک ایسی پختہ، سن رسیدہ اور دانشمند خاتون سے جس نے پندرہ سال سے اپنے شوہر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہو، شوہر کا کوئی عیب اس سے چھُپ نہیں سکتا۔ دُنیوی اغراض کے لیے ایک بیوی اپنے شوہر کے ناجائز کاموں میں بھی شریک ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پر ایمان کسی صورت نہیں لا سکتی۔ عقیدۃً بھی وہ یہ ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص خدا کا رسول ہو سکتا ہے یا اسے ہونا چاہیے۔ لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی اس حد تک معتقد تھیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت کا ماجرا بیان فرمایا تو انہوں نے ایک لمحہ کا تامل کیے بغیر اسے تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد قریب ترین مثال حضرت زیدؓ بن حارث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ قریب سے دیکھنے والے دوسرے شخص حضرت زیدؓ بن حارث ہی تھے جو غلام کی حیثیت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں آتے تھے تو پندرہ برس عمر تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا آغاز ہوا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر تیس سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے پندرہ سال انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہ کر ہر طرح سے اور ہر پہلو سے آپؐ کی زندگی کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی شہادت ایک خاص

صورتِ واقعہ میں سامنے آئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ بچپن میں والدین سے بچھڑ گئے تھے، اور خدا کی قدرت نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا۔ جب ان کے والدین اور ان کے چچا کو معلوم ہوا کہ ہمارا بیٹا فلاں جگہ غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو وہ مکہ معظمہ آئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے آکر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ:

آپ کا احسان ہوگا، اگر آپؐ ہمارے اس بیٹے کو آزاد فرما دیں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"میں لڑکے (زید) کو بلا لیتا ہوں، وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو میں آپ کے ساتھ روانہ کر دوں گا، اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو میرے ساتھ رہنا چاہے تو اسے زبردستی اپنے سے علیحدہ کر دوں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ نے بہت انصاف کی بات کہی ہے۔ آپ زید کو طلب فرمائیے۔ جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سامنے آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ان لوگوں کو پہچانتے ہو ؟

حضرت زیدؓ نے کہا:

"جی ہاں! یہ میرے والد اور چچا ہیں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"یہ تمہیں گھر واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں، تم جانا چاہو تو بڑی خوشی سے ان کے ساتھ جا سکتے ہو"

ان کے والد اور چچا نے بھی یہی کہا کہ "ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں"

حضرت زیدؓ بن حارث نے کہا کہ:

"میں نے ان میں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ) ایسی خوبیاں

دیکھی ہیں کہ جن کے بعد انہیں چھوڑ کر میں اپنے باپ اور چچا اور رشتہ داروں کے پاس نہیں جانا چاہتا۔"

یہ تھی آپؐ کے اخلاق کے بارے میں آپؐ کے خادم کی گواہی۔ ایک خادم احسان مند تو ہو سکتا ہے لیکن اتنا متاثر اور گرویدہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے مخدوم پر ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کردار کی ایسی بلندی اور اخلاق کی ایسی پاکیزگی دیکھی ہو کہ جس کے بعد اسے یہ ماننے میں ذرا تامّل نہ ہو کہ میرا مخدوم نبی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ حضرت زیدؓ بن حارثؓ کسی معمولی قابلیت کے آدمی نہیں تھے۔ مدینہ طیبّہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت قائم ہوئی تو انہیں بکثرت فوجی مہمات میں لشکر مجاہدین کا سالار بنایا گیا یہ گواہی ایسی قابلیّت کے انسان کی گواہی تھی۔

پھر حضرت ابو بکرِ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہیں نبوّت سے پہلے بیس سال تک ایک گہرے دوست کی حیثیت سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی نشست و برخاست آپ کے ساتھ تھی اور مکہ معظّمہ میں سب سے زیادہ جن دو آدمیوں کی دوستی تھی ان میں سے ایک حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم تھے اور دوسرے حضرت ابو بکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ایک دوست اپنے دوست کو پسند کر سکتا ہے، اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔ لیکن کبھی اتنا معتقد نہیں ہو سکتا کہ اس کو نبی مان لے۔ حضرت صدیقؓ کا بلا تامّل آپؐ کو نبی مان لینا ظاہر کرتا ہے کہ بیس سال کی ایک طویل مدّت کے دوران میں انہوں نے آپؐ کو اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کا مجسّم نمونہ پایا۔ جب ہی تو انہوں نے یہ تسلیم کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ اتنے بلند کردار کا آدمی یقیناً نبی ہو سکتا ہے اور اس کو نبی ہونا چاہیے۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام میں نے پہلے اس لیے نہیں لیا کہ اس وقت

وہ دس سال کے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی۔ لیکن دس سال کا بچہ بھی جس کے گھر میں ہو جس کے پاس رہتا ہو اس کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے خصوصاً اتنا ذہین انسان جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خصوصیات کی بنا پر آگے چل کر ثابت ہوئے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچپن میں بھی یقیناً اتنی ذہانت رکھتے تھے کہ جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین بچے کا اس بات کو مان لینا اس کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپؐ کی شفقت اور آپؐ کے انتہائی پاکیزہ اخلاق و کردار سے واقف تھا۔

اس لیے عمل صالح کے سلسلہ میں ان اعلیٰ مثالوں سے معلوم ہوا کہ انسان جس چیز کو پیش کر رہا ہو۔ اس کی زندگی ٹھیک اس دعوت کے مطابق بسر ہو رہی ہو وہ اتنے پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار کا مالک ہو کہ جب وہ اللہ کے راستے کی طرف بلانے کے لیے اُٹھے تو اُس کی بات میں وزن ہو۔ اور اس کے قول میں اثر ہو۔ اس کا عمل شہادت دے اور لوگ تسلیم کریں کہ یہ واقعی اپنے قول میں سچّا ہے قطع نظر اس سے کہ لوگ اس چیز کو مانیں یا نہ مانیں۔ لیکن یہ تو اُن کو ماننا پڑے گا کہ یہ آدمی اپنے قول میں سچّا ہے۔ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ اس بنا پر کہہ رہا ہے کہ وہ اس نظریے اس اصول اور اس دعوت کا حامل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن ابوجہل نے ایک مرتبہ خود کہا "کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تم کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جو تم لائے ہو جھوٹا کہتے ہیں"۔ یعنی آپؐ کا بدترین دشمن بھی آپؐ کی صداقت کا قائل تھا، پس ایک داعی کی دوسری بڑی خصوصیت اس کے قول و فعل کی مطابقت ہے یہ بلندیٔ کردار ہے اور یہ پاکیزگیٔ اخلاق ہے۔

تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (یعنی وہ کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں) اسے سمجھنے کے لیے مکہ معظمہ کا وہ ماحول پیش نظر رہنا چاہیے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کسی فرد کا اُٹھ کر یہ اعلان کرنا کہ میں

مسلمان ہوں، کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ درندوں کو اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دینا تھا — تو داعیٔ حق کی یہ خصوصیت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہو، نہ صرف پاکیزہ عمل رکھنے والا ہو، بلکہ وہ بدترین دشمنوں اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اپنے مسلمان ہونے سے انکار نہ کرے اپنے مسلمان ہونے کو چھپائے نہیں۔ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان اور اقرار کرنے میں وہ نہ شرمائے، نہ جھجکے اور نہ ڈرے۔ بلکہ کھلم کھلا یہ کہے کہ "ہاں میں مسلمان ہوں۔ جو کچھ جس کا جی چاہے کرلے"۔ دوسرے الفاظ میں داعیٔ حق کی تیسری بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ نہایت جری آدمی ہو، نہایت بہادر آدمی ہو — کسی بزدل آدمی کا کام نہیں ہے کہ وہ خدا کے راستے کی طرف دعوت دے جو ذرا سی چوٹ لگنے پر بلبلے کی طرح بیٹھ جانے والا ہو۔ ایسا انسان کبھی خدا کے راستے کی طرف نہیں بلا سکتا۔ خدا کے راستے کی طرف دعوت جو شخص دے سکتا ہے وہ، وہ ہے جو سخت سے سخت دشمنی کے ماحول میں، مخالفت کے ماحول میں، خطرات کے ماحول میں اسلام کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ذات، اس شجاعت کا ایک مکمل اور عملی نمونہ ہے۔ مکہ معظمہ میں کھلم کھلا آپؐ نے دعوت اسلام پیش کی، شہادت حق کا فریضہ انجام دیا اور ان لوگوں کے درمیان یہ کام جاری رکھا، جو آپؐ کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے، جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ آپؐ مسلسل تیرہ سال تک اس ماحول کی تمام تر تاریکیوں، سختیوں اور مصیبتوں کے درمیان اپنی دعوت پیش کرتے چلے گئے۔ پھر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد جو حالات پیش آئے۔ جن خطرناک اور بڑی بڑی لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا، ان میں بھی آپؐ کا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ غزوۂ حنین کے موقع پر جب کہ مسلمانوں کو تقریباً شکست ہوچکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اپنے مقام پر موجود رہے

بلکہ میدان جنگ میں برابر آگے دشمن کی صفوں کی طرف بڑھتے چلے گئے اور اس بات کو چھپایا بھی نہیں کہ "میں کون ہوں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ
أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

"میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں — میں ابن عبد المطلب ہوں"

یہ اعلان آپؐ اس جنگ میں ایسے حالات کے دوران میں کر رہے تھے، جب آپؐ دشمنوں کے نرغے میں تھے اور ساتھ صرف دو تین ساتھی رہ گئے تھے، اس وقت بھی یہ کہا کہ "ہاں! میں نبی ہوں" اس سے ظاہر ہوا کہ ایک داعیِ حق کو اتنا شجاع اور اتنا بہادر ہونا چاہیے جو اللہ کی راہ کی طرف دعوت دینے کے لیے کھڑا ہو۔ اگر داعی میں ہمت، شجاعت، استقامت اور بہادری کا جوہر نہ ہو تو وہ اس راہ میں کھڑا ہو نہیں سکتا، اور اگر کھڑا ہو بھی جائے تو اپنی بزدلی کی وجہ سے اُلٹا اس مشن کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔[1]

⁂ ⁂ ⁂

[1] خطبات یورپ ص ۳۴۳

دعوتِ اسلامی کے کام کے لیے شخصی اور جماعتی اوصاف

داعی کے اوصاف کے بعد اب میں مختصر طور پہ آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم از کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے لیے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں جن کے بغیر ایک داعیٔ حق اپنا فریضۂ دعوت ادا نہیں کر سکتا۔

شخصی اوصاف

۱۔ شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنائے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ

"حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے۔"

یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لیے نکلیں اس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنیٰ بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر امتناعِ شراب کی لڑائی ہو رہی ہے

یہ تضاد ہماری تحریک کے لیے تباہ کُن ہے۔ پہلے خود خدا کے آگے سر جُھکا دیتے، پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجیے۔

۲ــــ جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا اصل مدّعا گھر بار چھوڑنا نہیں ہے بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے اصلی مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کے وطن میں قانونِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرماں برداری اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔ یہ حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے۔ بطور مثال ایک حدیث کو لیجیے۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ:

ای الھجرۃ افضل یارسول اللہ

"یارسول اللہ کون سی ہجرت افضل ہے۔"

جواب ملا:

ان تھجر ما کرہ ربک

"یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔"

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترکِ وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیئے اور اصطلاحی کفّار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنایئے۔ اس معنیٰ کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حدیث نبوی کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنایئے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور کتنا ہی گھومے پھرے بہرحال اس حد سے آگے نہیں جا سکتا جہاں تک رسّی اسے جانے دیتی ہے:

مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اخیتہ

یجول ثم یرجع الی اخیتہ۔

ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جو

ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم یہ اُٹھائیے کہ اپنے قریبی ماحول سے جسے میں "ہوم فرنٹ" کہوں گا، لڑنا شروع کر دیجیے۔ گھر کے لوگ، اعزا، دوست اور سوسائٹی جس سے آپ کا گہرا رابطہ ہے، ان سب سے ایک عملی کش مکش شروع ہو جانی چاہیے۔ کش مکش اس معنیٰ میں نہیں کہ آپ اپنے متعلقین سے کشتی لڑیں، یا ان سے تُو تُو مَیں مَیں اور مناظرہ شروع کر دیں بلکہ یہ کشمکش اس معنیٰ میں ہونی چاہیے کہ آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دل دادہ اور اپنے اصول وضوابط کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابندِ اصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں۔ آپ کی بیویاں، آپ کی اولادیں، آپ کے والدین، آپ کے رشتہ دار اور دوست آپ کے رویہ کے خلاف مزاحمت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ جائیں، جہاں آپ کسب معاش کے لیے کام کرتے ہوں وہاں آپ کا وجود نمایاں طور پر کھٹکنے لگے۔ دفتر کی آرام دہ کرسی جس پر بیٹھ کر جاہ و ترقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں آپ کے لیے انگاروں کی انگیٹھی بن کر رہ جائے۔ غرض جو جتنا زیادہ قریبی ہو اس سے اتنا ہی پہلے تصادم شروع ہو جانا چاہیے۔ جس شخص کے گھر میں میدانِ جہاد موجود ہو وہ آخر چند میل کے فاصلہ پر ہی کیوں لڑنے جاتے۔ پہلا معرکہ تو گھر ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ اب تک جہاں جہاں اس کش مکش کی اطلاعات آرہی ہیں وہاں کے لوگوں سے مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آرہی ہیں وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔

مگر میں بر وقت یہ واضح کر دوں کہ یہ ساری کش مکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کش مکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام تر جدّوجہد ہمدردی کی رُوح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر اخلاص ہوتا ہے دشمنی نہیں ہوتی۔ اس کی نفرت اور اس کا غصّہ بالکل مرض کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ مریض کے خلاف۔ بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لائیے۔ وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیر سے دیکھا جا رہا ہے یا براہ راست اس کی ذات سے دشمنی کی جا رہی ہے بلکہ وہ آپ کے اندر انسانی ہمدردی، محبّت اور اخوت کو کام کرتا ہوا پائے۔

فی الحقیقت اصلی تبلیغ تقریری اور تحریری مناظروں سے نہیں ہوا کرتی۔ یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنیٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسّم ظہور اور نمونہ ہوں۔ جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے یہ نمونہ گزر جائے وہ آپ کے طرزِ عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کی راہ کے راہی۔ جس طرح کوئی "فنا فی الکانگریس" آدمی سامنے آجاتا ہے تو کانگریسیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اسی طرح آپ ایسے فنا فی الاسلام بن جائیے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے یہی وہ چیز ہے جسے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ:

اِذَا رُءُوا ذُکِرَ اللہ

میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا فوراً ہو جانا چاہیے۔ یہ مقام تو تدریجاً ہی حاصل ہو گا۔ خدا کی راہ میں جب اپنے ماحول سے پیہم آپ کا تصادم ہوتا رہے گا اور آپ ہر آن، ہر لمحہ اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے ہوئے قربانیاں دیتے رہیں گے تو ایک مدّت میں جا کر فنائیت کی کیفیت آپ پر طاری ہو گی اور اپنی دعوت کا مجسّم ظہور

بن سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے قرآن و حدیث کا گہری نظر سے بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرز کے آدمی تیار کیا کرتے تھے۔ وہ کیا صفات تھیں جو تحریک کے کارکنوں میں پیدا کی گئیں۔ دُنیا کے سب سے بڑے مربّی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انسان تیار کیے تھے انہیں ۱۵ برس کی تیاری کے بعد میدان میں لایا گیا۔ اس تیاری کی تفصیلات معلوم کیجیے اور دیکھیے کہ یہ کس تدریج کے ساتھ ہوئی تھی، اس میں کن صفات کی پرورش مقدم تھی اور کن کی مؤخر، کون سی صفات کس درجہ میں مطلوب تھیں اور انہیں کس حد تک ترقی دی گئی تھی اور کس مقام پر پہنچ کر اس جماعت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم دنیا کا بہترین گروہ بن گئے ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ نوع انسان کی اصلاح کے لیے نکلو۔ یہی نمونہ خود اپنی تیاری کے لیے بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ میں صرف دو حدیثیں آپ کی رہنمائی کے لیے پیش کروں گا جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کام کے لیے کن صفات کے آدمی درکار ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَنْ احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطیٰ للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان۔

"یعنی آدمی پورا مومن اس وقت بنتا ہے جب اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی دوستی اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ ہو خالص اللہ کے لیے ہو نفسانی اور دُنیوی محرکات اس کے لیے ختم ہو جائیں۔"

دوسری حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أمرنی ربی بتسع

"میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم دیا ہے:"

۱۔ خشیۃ فی السر والعلانیۃ

کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں

۲۔ وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا

کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصّہ میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں۔

۳۔ والقصد فی الفقر والغنا

خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت میں، بہرحال راستی و اعتدال پر قائم رہوں

۴۔ وان اصل من قطعنی

اور یہ کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں

۵۔ واعطی من حرمنی

اور جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں

۶۔ واعف من ظلمنی

اور جو مجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کروں

۷۔ وان یکون صمتی فکرا

اور یہ کہ میری خاموشی تفکّر کی خاموشی ہو

۸۔ ونطقنی ذکرا

اور میری گفتگو ذکرِ الٰہی کی گفتگو ہو

۹۔ ونظری عبرۃ

اور میری نگاہ، عبرت کی نگاہ ہو۔"

ان اوصافِ مطلوبہ کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ

اُمرت ان امر بالمعروف وانھیٰ عن المنکر

"یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔"

معلوم ہوا کہ نیکی کو پھیلانے اور بدی کو ختم کرنے کے لیے جو اُمّتِ وسط اُٹھے اس کے فرد فرد میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔ انہی اوصاف کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے، یہ نہ ہوں تو ہم کبھی اپنے منصب کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔

جماعتی اوصاف

یہ تو شخصی اصلاح کا پروگرام ہوا۔ اس سے آگے اجتماعی حیثیت سے کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے، جماعتی نظم کو مستحکم اور کارگر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ارکان جماعت کے درمیان محبّت و ہمدردی ہو، آپس میں حسن ظن ہو۔ بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو۔ آپس میں کام کرنے کی صلاحیت ہو۔ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت ہو۔ خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں۔ یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لیے ناگزیر ہیں۔ ورنہ اگر فرداً فرداً سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفاتِ حَسَنَہ اپنے اندر پیدا کرلیں لیکن منظّم و مربوط نہ ہوں۔ آپس میں متعاون نہ ہوں۔ شانہ سے شانہ ملا کر نہ چل سکیں تو ہم علمبرداران باطل کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان ہم میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور اگر آج ہم دُنیا بھر کو چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہوں گے۔ تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جاسکے۔ مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے، جن لوگوں نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے، انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد پر اپنا اثر پھیلا دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا پہلوان جو بھاری بوجھ اُٹھانے اور کئی کئی آدمیوں کو کشتی میں بچھاڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔ ایک مربوط رجمنٹ کے مقابلہ میں بالکل بے کار ہے اسی طرح ہم میں سے کچھ لوگوں کی مثال انفرادی تزکیہ کی حیثیت سے اس پہلوان کی سی ہے۔ جو کسی رجمنٹ کا عضو بن کر کام نہیں کرتا بلکہ منفرداً ایک رجمنٹ کو دعوت مبارزت دیتا ہے انفرادی تزکیہ کے لحاظ سے ہماری اپنی جماعت میں بھی ایسے رفقاء کی

کمی نہیں ہے جن کی حالت پر مجھے خود رشک آتا ہے مگر جہاں تک جماعتی تزکیہ کا تعلق ہے، حالات افسوسناک ہیں ۔ اس لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ جماعتی حیثیت سے کیا کچھ ترک کر دینے کے قابل ہے اور اس کی جگہ کیا کیا چیزیں مطلوب ہیں۔

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصّل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اصول کی مکمل تشریحات موجود ہیں پھر سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم اور سیر الصحابہ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجیے اور ناپ تول کر دیکھیے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے۔ اور اس کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجیے۔

صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لامحالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسن ظن، ہمدردی، ایثار اور رواداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف تعاون کو چار دن بھی جاری نہیں رہنے دے گا۔ جماعتی نظام چلتا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لیے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لیے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہیے

مجاہدہ فی سبیل اللہ کے ضروری لوازم

تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لوازم میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قرآن و حدیث میں مفصّل تذکرہ موجود ہے صرف تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک ایک مطلوبہ صفت کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ وہ کس نوعیت اور کس درجہ کی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں احکام و ہدایات کو جمع کیجیے اور سمجھیے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ میں مختصراً ان کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں:

سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے صبر ہے، صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دنیا کے لیے مجاہدہ کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے، بہرحال صبر ناگزیر ہے۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی راہ میں جدو جہد کرتے ہوئے دشواریوں اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلہ میں استقامت دکھائی جائے اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو تب بھی ہمت نہ ہاری جائے اور پیہم سعی جاری رکھی جائے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات اور خوف وطمع کے مواقع بھی اگر پیش آجائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی صبر ہی کا ایک شعبہ ہے کہ اشتعالِ جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اُٹھائے۔ ہمیشہ سکون، صحتِ عقل اور ٹھنڈی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرے، پھر حکم صرف صبر ہی کا نہیں مصابرت کا بھی ہے، یعنی مخالف طاقتیں اپنے باطل مقاصد کے لیے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اسی لیے "اِصْبِرُوْا" کے ساتھ "صَابِرُوْا" کا بھی حکم دیا گیا ہے جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ حق کی علمبرداری کے لیے اُٹھنے کا داعیہ رکھتے ہیں ان کے صبر کا اپنے صبر سے موازنہ کیجیے اور سوچیے کہ آپ کے صبر کا کیا تناسب ہے؟ شاید ہم ان کے مقابلہ میں ۱۰ فی صدی کا دعویٰ کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ باطل کے غلبہ کے لیے جو صبر وہ دکھا رہے ہیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی باطل کے لیے جنگوں کے حالات پر نظر ڈالیے کس طرح وقت آپڑنے پر ان لوگوں نے اپنے ان کارخانوں شہروں اور ریلوے اسٹیشنوں کو اپنے ہاتھوں سے پھونک ڈالا جن کی تعمیر و تیاری میں سالوں کی محنتیں اور بے شمار روپیہ صرف

کیا گیا تھا۔ یہ ان ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو فوجوں کو اپنے آہنی پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں یہ دشمن کے ان بمبار طیاروں کے سامنے میں استقامت سے کھڑے رہتے ہیں جو موت کے پر لگا کر اُڑتے ہیں۔ جب تک ان کے مقابلہ میں ہمارا صبر ۰.۵ فیصدی کے تناسب پر نہ پہنچ جائے ان سے کوئی ٹکر لینے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ جب سر و سامان کے لحاظ سے ہم ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر سر و سامان کی کمی کو صبر ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو مجاہدہ کا لازمہ ہے، ایثار کی صفت ہے، وقت کا ایثار، محنتوں کا ایثار اور مال کا ایثار! ایثار کے اعتبار سے بھی باطل کا جھنڈا اُٹھانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں، حالانکہ بے سر و سامانی کی تلافی کے لیے ہمیں ایثار میں بھی ان سے میلوں آگے ہونا چاہیے۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ایک شخص بیس، پچاس، سو اور ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے عوض اپنی پوری صلاحیتیں خود اپنے دشمن کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس طرح ہماری قوم کا کارآمد جوہر بے کار ہو جاتا ہے یہ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ ایک بڑی آمدنی کو چھوڑ کر یہاں محض بقدرِ ضرورت قلیل معاوضہ پہ خدمتِ حق کے لیے اپنی خدمات پیش کر دے۔ پھر فرمایئے کہ اگر یہ لوگ اتنا ایثار بھی نہ کریں گے اور اس راہ میں پتہ مار کر کام نہ کریں گے تو پھر اسلامی تحریک کیسے پھل پھول سکتی ہے ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک محض والنٹیروں کے بل پہ نہیں چل سکتی۔ جماعتی نظم میں والنٹیروں کو اسی درجہ کی اہمیت حاصل ہے جیسی ایک آدمی کے نظامِ جسمانی میں پاؤں اور ہاتھ کو ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضا کس کام کے ہو سکتے ہیں اگر ان سے کام لینے کے لیے دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے دماغ موجود نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں والنٹیروں سے کام لینے کے لیے اعلیٰ درجہ کے جنرل چاہئیں مگر مصیبت یہ ہے کہ جن کے پاس دل اور دماغ کی قوتیں ہیں وہ دنیوی ترقیوں کے دلدادہ ہیں اور مارکیٹ میں اسی کی طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے

ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کر سکیں۔ اس ایثار کو لے کر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفسدین عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانوں کا ایثار کر رہے ہیں۔ ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

۳ــــ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے تیسری صفت دل کی لگن ہے محض دماغی طور پر ہی کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہو جانا، یہ اس راہ میں اقدام کے لیے صرف ایک ابتدائی قدم ہے لیکن اتنے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ سی بھڑک اُٹھے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہیے جتنی اپنے بچہ کو بیمار دیکھ کر ہو جایا کرتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے، یا اتنی جتنی گھر میں غلّہ نہ پا کر بھڑکتی ہے اور آدمی کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دُھن میں لگائے رکھے، دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجیے کہ آپ اپنی ذات کے لیے اپنی قوت اور وقت کا کم سے کم حصّہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدّوجہد اپنے مقصد حیات کے لیے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہوگی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ ساتھ تن من دھن سے اس کام میں شریک ہوں۔ میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں، حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں محض دماغی اطمینان کی بنا پر شریک جماعت تھا۔ مگر

اب یہ چیز دل میں اتر گئی ہے اور اس نے نہاں خانۂ روح پر قبضہ جما لیا ہے میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود کو تنقید کر کے دیکھے کہ ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اس کے دل میں مقصد کے عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن ہوتی ہے وہاں کسی ٹھیلنے اور اُکسانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک رُکن پیچھے ہٹ گیا یا نقلِ مقام پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوپٹ ہو گیا بخلاف اس کے پھر تو ہر شخص اس طرح کام کرے گا جس طرح وہ اپنے بچے کو بیمار پا کر کیا کرتا ہے۔

خدانخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکلیہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ عذر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ بیٹھیں کہ کوئی تیمار دار نہیں، کوئی دوا لانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو آپ خود سب کچھ بنیں گے کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ سوتیلا باپ تو بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا۔ اس کے تو دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی نااہلی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرجانے دیں اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں، یہ سب باتیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سربلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سوتیلا رشتہ ہے حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پشیمانی کے سوا کچھ

نہ ہوگا اور یہ ایسی بُری پسپائی ہوگی کہ مدّتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوتِ قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجیے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔

۴۔ چوتھی ضروری صفت اس راہ میں یہ ہے کہ ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور منضبط (SYSTEMATIC) طریقہ سے کام کرنے کی عادت ہو۔ ایک مدّتِ دراز سے ہماری قوم اس طریقِ کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے جو قدم اُٹھایا جائے اس میں ہنگامہ آرائی ضرور ہو۔ چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کے رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے اس کی جگہ تدریج اور بے ہنگام کام کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی جو بجائے خود ضروری ہو، اگر آپ کے سپرد کر دیا جائے تو بغیر کسی نمایاں اور معجّل نتیجہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی کام میں کھپا دیں۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں رہا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نظر میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔

داعیٔ حق کے ان اوصاف کے بارے میں ہم براہ راست قرآن کی رہنمائی کی طرف آتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اہلِ باطل اہلِ حق کو ہلکا نہ پائیں

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ
الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ○ (الروم : ۶۰)

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔"

"اللہ کا وعدہ سچا ہے۔" اس سے اشارہ ہے اس وعدہ کی طرف جو اسی سورۃ آیت ۴۷ میں گزر چکا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سُنّت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی بیّنات کا مقابلہ تکذیب و تضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے (فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا) اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نصرت فرمائے (وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ)

ا — ہلکا نہ پائیں۔ یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ یا ان کے بہتان و افترا کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ یا ان کی پھبتیوں طعنوں اور تضحیک و استہزا سے تم پست ہمت ہو جاؤ یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ یا ان کے دیئے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کر رہے ہیں ان کی

ا۔ تفہیم القرآن

بنا پر تم ان کے ساتھ مصالحت کر لینے پر اتر آؤ، اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوش مند اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عزم میں اتنا راسخ، اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جاسکے نہ کسی قیمت پر تمہیں خریدا جاسکے۔ نہ فریب سے تم کو پھسلایا جاسکے نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے اور نہ دین کے معاملہ میں کسی لین دین کا سودا تم سے چکایا جاسکے، یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلام بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ "یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں" اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھاری بھر کم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپؐ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی اس نے اسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیت عظمیٰ نے وہ انقلاب برپا کر کے دکھا دیا جسے روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی طاقت اور وسائل صرف کر دیئے اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔[1]

اقربا کو اوّلین دعوت

وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۝ (الشعراء : ۲۱۴)

"اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔"

یعنی خدا کے اس بے لاگ دین میں جس طرح نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات کے لیے کوئی رعایت نہیں۔ اسی طرح نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان اور اس کے قریب ترین رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے بھی کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (MERITS) کے لحاظ سے ہے

---

[1] تفہیم القرآن۔

کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار بچے رہ جائیں اس لیے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف تنبیہ کر دو۔ اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آسکے گی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا بنی عبد المطلب یا عباسؓ یا صفیہ عمۃ رسول اللہ یا فاطمہؓ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انقذوا انفسکم من النار فانی لا املك لکم من اللہ شیئا سلونی من مالی ماشئتم۔

اے بنی عبد المطلب، اے عباسؓ، اے صفیہؓ رسول اللہ کی پھوپھی اے فاطمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے جو چاہو مانگ سکتے ہو۔" پھر آپؐ نے صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ) اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لوئی، اے بنی مرہ، اے آل قصی، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد شمس، اے بنی ہاشم، اے آل عبد المطلب اسی طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتا چل جاتا وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا جب سب لوگ جمع ہو گئے تو

آپؐ نے فرمایا:

"لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اسی پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟"

سب نے کہا ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو

آپؐ نے فرمایا:

"اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے، ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پہ اُٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، مگر میں مجبور رہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔"

اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زبیرؓ بن عمرو اور حضرت قبیصہؓ بن مخارق سے مروی ہیں۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں اَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ کا حکم آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی دراصل اس میں جو اصول واضح کیا گیا تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں جو چیز زہر قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو متنبہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا ہلاک

ہو جائے گا اور جو چیز نافع ہے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور عزیزوں کو اس کی تلقین کرے تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے اسی طریقے پر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم زندگی بھر عامل رہے۔ فتح مکّہ کے روز جب آپؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اعلان کیا کہ:

کل ربا فی الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی ھاتین
واقل ما اضعہ ربا العباس"

"زمانہ جاہلیت کا ہر سود جو لوگوں کے ذمّہ تھا میرے ان قدموں کے
تلے روند ڈالا گیا اور سب سے پہلے جس سود کو میں ساقط کرتا ہوں
وہ میرے چچا عباسؓ کا ہے۔"

(واضح رہے کہ سُود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے حضرت عباسؓ سود پر روپیہ چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سُود اس وقت لوگوں کے ذمہ وصول طلب تھا) ایک مرتبہ چوری کے جرم میں قریش کی ایک عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپؐ نے حکم دیا۔ حضرت اسامہؓ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

مداہنت سے پرہیز

"اے نبی! تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے جُوں کا توُں) سُنا دو کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردّ و بدل کرو گے تو) اس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے

پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔[1]

جائے پناہ نہ پاؤ گے" اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کی خاطر قرآن میں کچھ ردّ و بدل کر دینے اور سرداران قریش سے کچھ کم و بیش پر مصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اب اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس سے منع فرما رہا تھا بلکہ دراصل اس میں روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے اگرچہ بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اسے بے کم و کاست پہنچا دیں۔ تمہیں ماننا ہے تو اس پورے دین کو جُوں کا توں مانو جو خداوند عالم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو۔ مگر یہ امید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمہیں راضی کرنے کے لیے اس دین میں تمہاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو۔ یہ جواب ہے اس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمہاری پوری بات مان لیں۔ آخر کچھ تو ہمارے دین کے عقائد اور رسم و رواج کی رعایت ملحوظ رکھو، کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمہاری مان لیں۔ اس پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے اور برادری پھوٹ سے بچ سکتی ہے قرآن میں ان کے اس مطالبے کا متعدد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا

---

[1] تفہیم القرآن۔ الکہف ۲۷ تا ۲۹

گیا ہے، مثال کے طور پر سورہ یونس کی آیت ۱۵ ملاحظہ ہو:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس: ۱۵)

"جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔"[1]

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو" یعنی اس کی بات نہ مانو" اس کے آگے نہ جھکو اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو، یہاں "اطاعت" کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے" یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد فرمائے ہیں۔ اصحاب کہف کے جو واقعات بیان ہوتے تھے ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے کس طرح اٹھ کر دو ٹوک بات کہہ دی کہ "ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے" اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوتے بلکہ پورے عزم کے ساتھ کہا کہ "ہم اس کے سوا کسی دوسرے اللہ کو نہ پکاریں گے" اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے" اور کس طرح انہوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سروسامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا۔ مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انہیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدانخواستہ ہماری قوم ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیر لے جانے میں

---

[1] تفہیم القرآن

کامیاب ہوگئی تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ ان واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے۔ اور سُنانا دراصل مخالفینِ اسلام کو مقصود ہے کہ ان مشرکین اور منکرین حق سے مصالحت قطعاً خارج از بحث ہے جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے اسے بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کر دو، مانتے ہیں تو ٹھیک ہے اور نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے جنہوں نے مان لیا ہے۔ خواہ وہ کمسن نوجوان ہوں، یا بے مال و زر فقیر یا غلام اور مزدور، بہر حال وہی قیمتی جوہر ہیں انہی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا اور ان کو چھوڑ کر ان بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پرواہ نہ کی جائے گی جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں، مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔ پھر فرمایا:

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم)، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے، ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو تمہیں بچا لے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔" (ہود: ۱۱۲، ۱۱۳)[۱]

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جُھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔"[۲] (بنی اسرائیل: ۷۳ تا ۷۵)

سلہ ۲ہ تفہیم القرآن

اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے ایک یہ کہ اگر حق جان لینے کے بعد باطل سے تم سمجھوتہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم توضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر بھڑک اُٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں دوہری سزا دی جاتی دوسرے یہ کہ انسان خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلاب بلا آپؐ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

بے جھجک اور بے خوف دعوت حق کا اعلان

"اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اُڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"[1] (الحجر ۹۴ تا ۹۶)

لوگوں کی خواہشات کی اتباع سے پرہیز

"تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے" اسی ہدایت کے کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ چکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ اس کی پکڑ سے تم کو کوئی بچا سکتا ہے۔"

---

[1] تفہیم القرآن

آیت اوّل ع۳۶ میں ایک سوال کا جواب ہے اور آیت ع۳۷ میں اپنی دعوت پر بلا لومۃ لائم عمل کرنے کی تاکید ہے۔

پہلی آیت میں ایک خاص بات کا جواب ہے جو اس وقت مخالفین کی طرف سے کہی جارہی تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر یہ صاحب واقعی وہی تعلیم لے کر آئے ہیں۔ جو پچھلے انبیاء لائے تھے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو آخر کیا بات ہے کہ یہود و نصاریٰ جو پچھلے انبیاء کے پیرو ہیں، آگے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کرتے۔ اس پر فرمایا جارہا ہے کہ ان میں بعض لوگ اس پر خوش ہیں اور بعض ناراض مگر اے نبیؐ! خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو خدا کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور میں بہرحال اسی کی پیروی کروں گا۔

جاہلی قوانین کی پیروی سے اجتناب

"تب یوسف علیہ السّلام نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کرلی۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی اس کا کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔"[1] (یوسف : ۷۵)

یعنی یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کی شان پیغمبری کے شایان شان نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ذاتی معاملہ میں شاہ کے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو روک رکھنے کے لیے انہوں نے خود جو تدبیر کی تھی اس میں یہ خلل رہ گیا تھا کہ بھائی کو روکا تو ضرور جا سکتا تھا مگر شاہ کے قانونِ تعزیرات سے کام لینا پڑتا اور یہ اس پیغمبر کی شان کے مطابق نہ تھا جس نے اختیارات حکومت غیر اسلامی قوانین کی

---

[1] تفہیم القرآن

جگہ اسلامی شریعت نافذ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں لیے تھے اگر اللہ چاہتا تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدنما غلطی میں مبتلا ہو جانے دیتا۔ مگر اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ یہ دھبہ اس کے دامن پر رہ جائے۔ اس لیے اس نے براہ راست اپنی تدبیر سے یہ راہ نکال دی کہ اتفاقاً برادرانِ یوسف سے چور کی سزا پوچھ لی گئی اور انہوں نے اس کے لیے شریعت ابراہیمی کا قانون بیان کر دیا۔ یہ چیز اس لحاظ سے بالکل برمحل تھی کہ برادران یوسف مصری رعایا نہ تھے۔ ایک آزاد علاقے سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ لہٰذا اگر وہ خود اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے آدمی کو اس شخص کی غلامی میں دینے کے لیے تیار تھے جس کا مال اس نے چرایا تھا تو پھر مصری قانونِ تعزیرات سے اس معاملہ میں مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، یہی وہ چیز ہے جس کو بعد کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان اور اپنی علمی برتری سے تعبیر فرمایا ہے، ایک بندے کے لیے اس سے بڑھ کر بلندئ درجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کبھی بشری کمزوریوں کی بنا پر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ غیب سے اس کو بچانے کا انتظام فرما دے۔ ایسا بلند مرتبہ صرف انہی لوگوں کو ملا کرتا ہے جو اپنی سعی و عمل سے بڑی بڑی آزمائشوں میں اپنا "محسن" ہونا ثابت کر چکے ہوتے ہیں اور اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام صاحبِ علم تھے خود بہت دانشمندی کے ساتھ کام کرتے تھے مگر پھر بھی اس موقع پر ان کے علم میں ایک کسر رہ گئی اور اسے اس ہستی نے پورا کیا جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

رہی یہ بات کہ جب ملک میں "دین الملک" جاری تھا ہی تو آخر حضرت یوسفؑ کی اپنی ذات کے لیے اس پر عمل کرنا کیوں شایان شان نہ تھا، تو یہ سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر غور کرنے سے بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلام جاری نہ ہوئے تھے لوگ پرانے طریقہ کے مطابق شراب پیتے رہے مگر کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پی؟ لوگ

سود لیتے تھے مگر کیا آپؐ نے بھی سودی لین دین کیا؟ لوگ متعہ کرتے رہے اور جمع بین الاختین کرتے رہے مگر کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اسلام کا عمل مجبوریوں کی بنا پر احکام اسلامی کے اجرا میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی رخصتیں دوسروں کے لیے ہیں۔ داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

دنیا پرستوں کی شان و شوکت سے بے نیاز

"تم اس متاع دُنیا کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جُھکو" (الحجر[1]: ۸۸)

قدر و قیمت کے مستحق صرف طالبینِ حق

"اور دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پُکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو" (الکہف[2]: ۲۸)

ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ، عمارؓ، خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے انہیں ہٹا دو تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ

---

[1][2] تفہیم القرآن

نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر تمہارے گرد جمع ہوتے ہیں اور شب و روز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی معیت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم ان مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ یہ دنیوی ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والے لوگ تمہارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہے مگر سُنانا دراصل سردارانِ قریش کو مقصود ہے کہ تمہاری یہ دکھاوے کی شان و شوکت، جس پر تم پھول رہے ہو۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ میں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے ٹھیک یہی معاملہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا وہ حضرت نوح علیہ السلام سے کہتے تھے (ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو رذیل لوگ ہیں وہ بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں) اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ "میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا" اور جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انہیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے"۔[۱]

(ہود آیت ۲۷، ۲۹، ۳۱۔ نیز سورہ انعام آیت ۵۲ اور سورہ الحج آیت ۴۸)

معاشرتی مرتبہ نہیں بلکہ قبولِ حق کا جذبہ

"انہوں نے جواب دیا "کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے"؟ نوحؑ نے کہا "میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں ان کا حساب تو میرے رب کے ذمّہ ہے، کاش تم کچھ شعور سے کام لو"

(الشعراء: ۱۱۱ تا ۱۱۳)

---

[۱] تفہیم القرآن

"تمہاری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے۔" یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو دعوت حق کا یہ جواب دیا ان کی قوم کے سردار اور اشراف تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصّے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے۔

اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ "ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بوجھے اختیار کرلی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے۔ جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوتے ہو۔" اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی رہے اونچے طبقہ کے بااثر اور خوشحال لوگ تو وہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اس سلسلے میں جو دلائل وہ نوح علیہ السّلام کے خلاف پیش کرتے تھے ان میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ اگر نوحؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء، علماء، مذہبی پیشوا معززین اور سمجھ دار لوگ اسے قبول کرتے لیکن ان میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شعور کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں؟

بعینہٖ یہی بات قریش کے کفّار نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرو یا تو غلام اور غریب لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابو سفیان نے ہرقل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ:

تَبِعَهُ مِنَّا الضُّعَفَاءُ وَالْمَسَاكِيْنُ۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے"[1]

گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا۔ کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ، تو اُن کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفّارِ مکّہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنا منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا:

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف: ۳۱)

"وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکّہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا"

"کاش تم کچھ شعور سے کام لیتے"۔ یہ اُن کے اعتراض کا پہلا جواب ہے جیساکہ اوپر ہوا ہے۔ ان کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور اونچے درجے کے لوگوں کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پہ مبنی، نہ ان کا اعتقاد لائق اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن حضرت نوح علیہ السلام اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لاتا ہے۔ اور ایک عقیدہ قبول کر کے

---

[1] تفہیم القرآن

اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے۔ اس فعل کی تہہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اور وہ کتنی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے۔ میرا اور تمہارا کام نہیں ہے :

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○

(الشعراء : ۱۱۴، ۱۱۵)

"میرا یہ کام نہیں کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں، میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا ہوں"

یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے۔ اس لیے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے نوحؑ کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اراذل اور سفہاء میں شمار کرائیں ؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صف میں آ بیٹھیں ؟ حضرت نوح علیہ السلام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرز عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے پیچھے تو پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایسے بے لاگ آدمی کی ہے۔ جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے۔ اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اس میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے راستے پر آئے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ پر چلتا رہے۔ میں یہ

لہ تفہیم القرآن

نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سُن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں۔ ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں "کمین" ہوں، تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف" حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اور کفّارِ مکّہ کے درمیان چل رہا تھا۔ اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سُنائی جا رہی ہے۔ کفّارِ مکّہ کے بڑے بڑے سردار نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلالؓ، عمارؓ اور صہیبؓ جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف ادھر کا رخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دو ٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبّروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکّے نہیں دیے جا سکتے:

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۝ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۝ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۝ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝

(عبس: ۵ تا ۱۲)[1]

"اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جس نے بے نیازی برتی تم اس کے پیچھے

---

[1] تفہیم القرآن

پڑتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے تم اس سے بے رُخی برتتے ہو؟ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔"

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (الانعام: ۵۲،۵۳)

"نہ دور پھینکو ان لوگوں کو جو شب و روز اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ محض اس کی خوشنودی کی خاطر، ان کا کوئی حساب تمہارے ذمہ نہیں اور تمہارا کوئی حساب ان کے ذمہ نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ ہم نے تو اس طرح اُن لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ کہیں "کیا ہمارے درمیان بس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا؟" ہاں کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا۔"

پیروی کے ساتھ غور و فکر

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (الشعراء: ۱۱۵،۱۱۶)

---

[1] [2] تفہیم القرآن

"اور ایمان لانے والوں میں سے جو تمہاری پیروی اختیار کریں۔ اُن کے ساتھ تواضع سے پیش آو، لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں۔ تو اُن سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں"

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے رشتہ داروں میں سے جو لوگ ایمان لاکر تمہاری پیروی کریں۔ ان کے ساتھ نرمی اور ملائمت اور تواضع کا رویہ اختیار کرو، اور جو تمہاری بات نہ مانیں ان سے اعلان برآت کر دو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف ان رشتہ داروں سے متعلق نہ ہو۔ جنہیں متنبہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ سب کے لیے عام ہو یعنی جو بھی ایمان لاکر تمہاری اتباع کرے۔ اس کے ساتھ تواضع برتو اور جو بھی تمہاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کر دو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت قریش اور آس پاس کے اہلِ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے عملاً آپؐ کی پیروی اختیار نہ کی تھی بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مِل جُل کر اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی دوسرے کفّار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ماننے والوں کو ان اہلِ ایمان سے الگ قرار دیا۔ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپؐ کا اتباع بھی اختیار کر لیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اسی مؤخر الذکر گروہ کے لیے تھا۔ باقی رہے وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری سے منہ موڑے ہوئے تھے جن میں آپؐ کی صداقت ماننے والے بھی شامل تھے اور آپؐ کا انکار کر دینے والے بھی۔ ان کے متعلق تو ہدایت کی گئی کہ ان کے ساتھ بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود بھگتو گے۔ تمہیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمہارے کسی فعل کی ذمہ داری نہیں ہے۔

مخالفت سے بے خوف

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ (ہود : ۱۱۰)

"ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح اس کتاب کے بارے میں کیا جارہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) اگر تمہارے رب کی طرف ایک بات پہلے ہی طے نہ کردی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔"

یہ آخری فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ تم اس بات کے لیے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ جلدی چکا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ فیصلہ وقت مقررہ سے پہلے نہ کیا جائے گا اور یہ کہ دنیا کے لوگ فیصلہ چاہتے ہیں جو جلد بازی کرتے ہیں، اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

مخالفین کی بے ہودگیوں کا مقابلہ

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝
(الحجر[۲]: ۸۵، ۸۶)

"پس اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم (ان لوگوں کی بے ہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے

---

[۱] [۲] تفہیم القرآن

کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے۔ جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لیے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن ہتھکنڈوں سے یہ تمہاری سعی اصلاح کی ناکام کوشش کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے لہٰذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائے گا۔

نیکیوں کے ذریعہ بُرائیوں کا ازالہ

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝

(ہود[۱] : ۱۱۴)

"نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں"

یعنی جو بُرائیاں دُنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جو بُرائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں۔ ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔

---

[۱] تفہیم القرآن

مخالفین کے بارے میں رویّہ

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (الرعد : ۴۰)

"اور اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) جس بُرے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اُس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اُٹھالیں۔ بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوتِ حق کو جُھٹلایا ہے اُن کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اور کب وہ ظہور میں آتا ہے۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسے پوری یکسوئی کے ساتھ کیے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو، یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات اُن مخالفین کو سُنانی مقصود ہے جو چیلنج کے انداز میں بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہماری جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی۔

داعئ حق کی قوت کے ذرائع

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ (الحجر : ۹۷ تا ۹۹)

"ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت

سلہ سلہ تفہیم القرآن

ہوتی ہے (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس
کی جناب میں سجدہ بجالاؤ اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو
جس کا آنا یقینی ہے[1]۔"

یعنی تبلیغ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے فرمایا گیا:

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی
کے ذریعے سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں
سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑی چیز ہے اللہ جانتا ہے جو
کچھ تم لوگ کرتے ہو[2]۔"

اقامت صلوٰۃ

"نماز قائم کرو" خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مگر دراصل مخاطب تمام اہل ایمان ہیں، ان پر جو ظلم وستم اس وقت توڑے جارہے تھے اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آرہا تھا۔

تلاوت قرآن

ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سورہ العنکبوت کے پچھلے چار رکوعوں میں صبر وثبات

---

[1] تفہیم القرآن۔ الحجر آیت ۹۷-۹۸

اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انہیں عملی تدبیر یہ بتائی جا رہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کرتی ہیں جن سے وہ باطل کی بڑی سے بڑی طغیانیوں اور مخالفت کے سخت سے سخت طوفان کے سامنے نہ صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان کا منہ پھیر سکتا ہے لیکن تلاوت قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی رُوح میں جذب کرتا چلا جائے اور اس کی نماز صرف حرکات بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اخلاق و کردار کی قوت محرکہ بن جائے، نماز کے وصف مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں قرآن خود بیان کر رہا ہے۔ رہی تلاوت تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی وہ اسے کفر کی طغیانیوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ:

يَقْرَأُوْا لْقُرْآنَ وَلَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَمْرُقُوْنَ
من الدين مروق السهم من الرمية[1]

"وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا
وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے۔ جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے"

درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن و فکر اور اخلاق و کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے، جس سے قرآن منع کرتا ہے وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفہیم القرآن

صاف فرماتے ہیں کہ:

ما آمن بالقرآن من استحل محارمہ۔

(ترمذی بروایت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

"قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا"

ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اس کی رُوح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلہ میں زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کیرکٹر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا ہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں۔ اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے اس کا معاملہ تو اس مجرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس پوزیشن کو سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے:

القرآن حجۃ لک او علیک (مسلم)

"قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف"

یعنی اگر تو قرآن کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجت ہے دُنیا سے آخرت تک جہاں بھی تجھ سے باز پرس ہو تو اپنی صفائی میں قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہو تو نہ دنیا میں کوئی قاضئ اسلام تجھے سزا دے سکے گا اور نہ آخرت میں داور محشر ہی کے ہاں اس پر تیری پکڑ ہو گی لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو اور تو نے اسے پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے منع کرتا ہے اور پھر تو اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجت ہے یہ تیرے خدا کی عدالت میں تیرے خلاف

فوجداری کا مقدمہ اور زیادہ مضبوط کر دے گی۔ اس کے بعد ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ جانا ہلکی سزا پانا تیرے لیے ممکن نہ رہے گا۔

"بُرے کاموں سے روکتی ہے" یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک اہم وصف ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے مکہ کے اس ماحول میں جن شدید مزاحمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ درپیش تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انہیں مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور اس کے نشوونما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشاندھی کی گئی۔ ایک تلاوتِ قرآن۔ دوسرے اقامت صلوٰۃ۔ اس کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامت صلوٰۃ وہ ذریعہ ہے جس سے تم لوگ ان برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمہارے گرد و پیش اہل عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اس وقت مبتلا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں رکھتا کہ یہ بجائے خود ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں نافع ہے جنہیں یہ پاکیزگی حاصل ہو۔ بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کو ان سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی بُرائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیت کے اس ناپاک نظام کو جو ان بُرائیوں کی پرورش کرتا ہے برقرار رکھنے کے لیے ان پاکیزہ انسانوں کے مقابلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ فحشا اور منکر کا اطلاق جن برائیوں پر ہوتا ہے انہیں انسان کی فطرت بُرا جانتی ہے اور ہمیشہ سے ہر قوم اور معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوتے ہوں۔ اُصولاً ان کو بُرا ہی سمجھتے رہے ہیں، نزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کلیے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اخلاق کی معروف خوبیوں اور بُرائیوں سے واقف تھے۔ بدی کے مقابلے

میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو بُرائی کو بھلائی سمجھتا ہو یا بھلائی کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں بگڑے ہوئے معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی سیرت و کردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ بُرائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصّبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر ان لوگوں کا ساتھ دیتے چلے جاتے جو خود اخلاقی بُرائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیت کے اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے، جو ان بُرائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادّی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر و تفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دے دے۔

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اپنا وصفِ لازم ہے، یعنی یہ کہ وہ فحشا اور منکر سے روکتی ہے۔ اور دوسرا اس کا وصفِ مطلوب ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی فحشا اور منکر سے رک جائے جہاں تک روکنے کا تعلق ہے۔ نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ بُرائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہو سکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بُلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے کہ تو اس دنیا میں آزاد خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھُلے اور چھُپے تمام اعمال سے حتیٰ کہ تیرے دل کے ارادوں اور

نیتوں تک سے واقف ہے۔ اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ پھر اس کی یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اُٹھنے کے وقت سے لے کر ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور لیظا ہر رُکوع وسجود اور قیام و رُکوع کرتے ہوئے اذکار نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اسی کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے لے کر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانون خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعہ سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے۔ اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے۔ اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبۂ اطاعت کے زیر اثر خفیہ اور اعلانیہ ہر حال میں اُس قانون کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دُنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فحشا و منکر سے روکتی ہے۔ بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریقِ تربیت ایسا نہیں ہے جو انسان کو بُرائیوں سے روکنے کے معاملہ میں اس درجہ مؤثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی بُرائیوں سے رُکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اُٹھانے کی نیت رکھتا ہو۔ اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مرتب ہوں گے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیرِ اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو یا جان بوجھ کر اس کے اثر کو دفع کرتا رہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشوونما ہے لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اسے جزءِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد تو ہر اتے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لاکر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجب تغذیہ بدن نہیں ہے۔ کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جارہا ہے۔ اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا جیسے کھانا کھا کر قے کرنے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہ و تابعین سے مروی ہے۔ عمران ابن حصین کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ لَّمْ تَنْهَهٗ صَلٰوتُهٗ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلٰوۃَ لَهٗ (ابن ابی حاتم)

"جسے اس کی نماز نے فحشا اور بُرے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز نہیں ہے"

ابن عباس حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں :

من لم تنهه صلوته عن الفحشاء و المنكر لم يزدد بها من الله الا بعدا ، (ابن ابی حاتم. طبرانی)

"جس کی نماز نے اسے فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دُور کر دیا"

یہی مضمون جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے مُرسلاً روایت کیا ہے (ابن جریر، بیہقی) ابن مسعود سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد مروی ہے:

لا صلوٰۃ لمن لا يطع الصلوٰۃ وطاعة الصلوٰۃ ان تنهى عن الفحشاء والمنكر (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

"اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے منکر کیا۔ نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحشاء و منکر سے رُک جائے"

اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، عبد اللہؓ بن عباس حسن بصریؒ، قتادہؒ اور اعمشؒ وغیرہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادقؓ فرماتے ہیں:

"جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں، اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشاء اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ بُرائیاں کرنے سے رک گیا ہے۔ تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (روح المعانی)

اللہ کا ذکر

"اللہ کا ذکر اس سے بڑی چیز ہے" اس کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ ایک[۱] یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اس سے بزرگ تر ہے اُس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے۔ کہ بُرائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر اُبھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز بھی ہے۔

دوسرا[۲] مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجائے خود بہت بڑی چیز ہے خیرالاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔

تیسرا[۳] مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے اس کو یاد کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۱۵۲)

"تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"

پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا۔ تو لامحالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف[۴] مطلب یہ بھی ہے جسے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے یا زکوٰۃ دیتا ہے یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لامحالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے۔ تبھی تو اس سے وہ عمل نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی بُرائی کے مواقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے۔ تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یادِ الٰہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

عبادت ذریعۂ قوت

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ○ وَاذْكُرِ اسْمَ
رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ○ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ
وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ○ (الدھر: ۲۴ تا ۲۶)[1]

"اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز رہو، اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔"

منکرِ حق کی بات نہ مانو یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور نہ کسی بدعمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تغیر کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے برملا حرام و ناجائز کہو۔ خواہ کوئی بدکار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو۔ اور جو عقائد باطل ہیں۔ انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں علانیہ حق کہو چاہے کفار تمہارا منہ بند کرنے یا اس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کرنے کے لیے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔ تسبیح کرتے رہو۔ یہ ہے علاج اس شدید دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ قرآن مجید کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلہ میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے وہاں اس کے معًا بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دین حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہو سکتا ہے مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعین پر ہو تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

قوت کا ذریعہ ۔ ذکر اللہ

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ۝
وَّسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا ۝ (الاحزاب[1]: ۴۱، ۴۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔"

اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہو رہی ہو۔ اور دینِ حق کو زک پہنچانے کے لیے ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو۔ ایسی حالت میں اہل ایمان کا کام نہ تو یہ ہے کہ ان بے ہودگیوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں۔ اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں اور نہ یہ کہ ان کے جواب میں گالم گلوچ کرنے لگیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کو اور زیادہ یاد کریں۔ "اللہ کو کثرت سے یاد کرنے" کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا۔ اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، انشاء اللہ

---

[1] تفہیم القرآن

اور ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہو گا۔ ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا۔ ہر بُرائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دُعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دُنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہو گا۔ یہ چیز دراصل اسلامی زندگی کی جان ہے دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انہیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائمی اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اسی طرح پروان چڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اسی دائمی ذکر خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عن معاذ بن انس الجهني عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان رجلا سأله اى المجاهدين اعظم اجرا يا رسول الله؟ قال اكثرهم لله تعالى ذكرا، قال

ای الصائمین اکثر اجرًا۔ قال اکثرهم ذکرا ثم ذکر الصلوٰة و الزکوٰة والحج، والصدقة کل ذالك یقول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اکثرهم ذکرا[1] (بخاری و مسلم)

"معاذ بن انس جہنی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "یا رسول اللہ جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو ان میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہے۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضور نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ "جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو"

داعیٔ حق کا جہاد کبیر

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ (الفرقان: ۵۲)

"پس اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔"

جہاد کبیر کے تین معنی ہیں۔ ایک انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جانفشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے جامع جدوجہد جس میں کوشش

---

[1] تفہیم القرآن

کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے۔ جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں۔ اس پر اپنی طاقت بھی لگا دے اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان وقلم کا جہاد بھی شامل ہے اور جان ومال کا بھی اور توپ وتفنگ کا بھی۔

دنیوی مفاد سے بے نیازی

قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام: ۹۰)

"اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ وہدایت) کے نام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔"

منصبِ دعوت کی ذمّہ داریاں

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

(الانعام: ۱۰۶، ۱۰۷)

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکوں کے پیچھے نہ پڑو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو، ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے۔ اور نہ تم ان پر حوالدار ہو۔"

لہ لہ تفہیم القرآن

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے۔ کوتوال نہیں بنایا گیا تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کردو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ تمہیں اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری وجواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقہ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے۔ اور جو آنکھیں کھول کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے۔ تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کرکے اُس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے۔ اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت حق کو قبول کریں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں اور جو اسے قبول نہ کریں۔ ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انہیں چھوڑ دو۔

اللہ کی پناہ کی دُعا

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔"

وسوسہ ڈالنے والوں کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے یعنی اس شر سے کہ وہ کہیں اس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے اس کے شر سے داعیٔ حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعیٔ حق کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اُس کی ذات کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں اُن سب تک خود پہنچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور ان کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے۔ اُس کے مقام سے یہ بات بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اترے ہوتے ہیں۔ اسی پر خود بھی اُتر آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہے۔ اس کے بعد ان سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ ربّ النّاس، مَلِک النّاس اور الٰہ النّاس کا کام ہے۔

وسوسہ عملِ شر کا نقطۂ آغاز

تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ عملِ شر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے تو پہلے اس میں بُرائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر مزید وسوسہ اندازی اُس بُری خواہش کو بُری نیت

اور بُرے ارادے میں تبدیل کردیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب وسوسے کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ عزم بن جاتا ہے۔ اور آخری قدم پھر عمل شر ہے۔ اس لیے وسوسہ انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کھلے کھلے کفر (شرک، دھریت) یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دین اللہ میں داخل ہی ہو جائے تو وہ کسی نہ کسی بدعت کی راہ سجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی ناکامی ہو تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں تو کوئی مضائقہ نہیں تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بارِ عظیم انسان پر لد جائے۔ اس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجہ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دین حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے اسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے لیکن اگر کوئی شخص ان تمام چالوں کو ناکام کر دے تو شیاطین جن وانس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پل پڑتی ہے۔ اس کے خلاف لوگوں کو اُکسانی اور بھڑکاتی ہے۔ اس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کراتی ہے۔ اسے ہر طرح بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اُس مرد مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے۔ اُٹھ اور ان حملہ آوروں سے بھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوت حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعیٔ حق کو راہ کے کانٹوں سے اُلجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی اگر داعیٔ حق بچ نکلے تو شیطان اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (الاعراف: ۲۰۰)

"اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی اُکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو"

وَقُلْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ (مومنون: ۹۷)

"کہو میرے پروردگار! میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں"

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۱)

"جو لوگ پرہیزگار ہیں۔ ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انہیں چھُو جائے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر انہیں (صحیح راستہ) صاف نظر آنے لگتا ہے"

اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اس آخری حربے سے بچ نکلیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حٰم السجدہ: ۳۵)[1]

"یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی"

نفس کے اغوا سے انتباہ

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ کہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطین جن و انس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُس کی اپنی ناجائز اغراض و خواہشات اُس کی قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اُس کو بہکاتا ہے یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے:

---

[1] تفہیم القرآن

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ

"اور ہم اس کے اپنے نفس سے اُبھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں۔"

اسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ مسنونہ میں فرمایا:

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا

"ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔"

اہلِ حق اور سخت آزمائشیں

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝

(البروج : ۱ تا ۸)

"قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور دیکھنے والے کی اور دیکھے جانے والی چیز کی کہ مارے گئے گڑھے والے (اس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

---

[1] تفہیم القرآن

ان آیات کے نزول کا مقصد کفّار کو اُن کے ظلم و ستم کے بُرے انجام سے خبردار کرنا ہے۔ جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے۔ اور اہل ایمان کو یہ تسلّی دینا ہے کہ ان کے صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اصحاب الاخدود کا قصّہ سُنایا گیا ہے۔ جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوتے گڑھوں میں پھینک کر جلا دیا تھا اور اس قصّے کے پیرائے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اصحاب الاخدود خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے۔ اُسی طرح سرداران مکّہ بھی اس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے والوں کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہل ایمان اصرار کرتے ہیں وہ سب پر غالب ہے۔ زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے۔ اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے اور دونوں گروہوں کے حال دیکھ رہا ہے۔ اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف ان کے کفر کی سزا جہنّم کی صورت میں ملے گی بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے چرکے دینے کی شکل میں بھگتنی پڑے گی۔ اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لاکر نیک عمل کرنے والے جنّت میں جائیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ

"مارے گئے گڑھے والے"

گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو ان میں پھینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر خدا کی لعنت پڑی اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ایک برجوں والے آسمان کی۔ دوسرے روز قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

تیسرے قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو ان مناظر کو دیکھے گی پہلی چیز اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو قادر مطلق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور سیاروں پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جا سکتا ہے۔ دوسری چیز کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں ان لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا۔ مگر وہ دن بہر حال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اس میں ہر مظلوم کی دادرسی اور ظالم کی پکڑ ہو گی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے اُن بے بس اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا۔ اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ ان کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو اُن میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رضؓ رومی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ:

"ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا۔ حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحب کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے۔ تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا۔ مگر کوئی ہتھیار اور حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمع عام میں بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ (اس لڑکے کے رب

کے نام پر کہہ کر مجھے تیر مارو میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصّے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوا دئیے۔ ان میں آگ بھر ڈالی اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا۔ اس کو آگ میں پھکوا دیا۔"

(احمد، نسائی، ترمذی، ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حمید)

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہو گئے۔ بات کھُلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اسی وقت سے مجوسیوں میں محرّمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔" (ابن جریر)

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ:

"بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا۔ جو اس سے انکار کرتے تھے۔

(ابن جریر، عبداللہ بن حمید)

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابن ہشام، طبری، ابن خلدون اور

صاحب معجم البُلدان وغیرہ اسلامی مورخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"حمیر (یمن) کا بادشاہ تبّان اسعد ابو کرب ایک مرتبہ یثرب گیا۔ جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دین یہود قبول کر لیا اور بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا۔ اور اس نے نجران پر جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے اصل دین پر قائم تھے) نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دین یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہل نجران میں سے ایک شخص دَوس ذُو ثعلبان بھاگ نکلا۔ اور ایک روایت کی رُو سے اُس نے قیصر رُوم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رُو سے حبش کے بادشاہ نجاشی کے یہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج آریاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذونواس مارا گیا یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

⁂ ⁂

دعوتِ حق میں کامیابی فخر نہیں شکر کا مقام

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۝ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر)

"جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دُعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"[1]

حضرت ابن عباسؓ و دیگر حضرات کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے۔ اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپؐ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اُس کے فضل سے آپؐ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے اور اس سے دعا کریں کہ اس خدمتِ دین کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپؐ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرما دے۔ اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ

---

[1] تفہیم القرآن

سکتا ہے۔ کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلاب عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے۔ جس کے لیے وہ کام کرنے اُٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جہالت وجاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اُٹھا کر اس قابل بنا دیا کہ وہ دُنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوام عالم کی امام بن جائے۔ مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دُعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی وفات سے پہلے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ کثرت سے پڑھتے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیسے کلمات ہیں جو آپؐ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہیں: إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ)

اسی سے ملتی جلتی بعض روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکوع وسجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ یہ قرآن (یعنی سورۃ نصر) کی تاویل تھی جو آپؐ نے فرمائی تھی (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اس کا شکر ادا کرنا بھی۔ اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزّہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی اس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آئے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اس امر کا اعتراف کرو کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اس سے پاک اور منزّہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمہاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اس پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس تمہارا دل اس یقین کے ساتھ لبریز رہے کہ تمہاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید و نصرت پر منحصر تھی۔ وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمہارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کرایا۔ اس کے علاوہ تسبیح یعنی سُبْحَانَ اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی محیّر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سُبْحَانَ اللہ کہتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اس سے صادر ہو سکے۔

وَاسْتَغْفِرْهُ ط اور اس سے مغفرت کی دُعا مانگو۔ یعنی اپنے رب سے دُعا مانگو کہ جو خدمت اُس نے تمہارے سپرد کی تھی۔ اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چُوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے

دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو۔ اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دے دی ہوں۔ اور اُس کی عبادت و بندگی بجالانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا۔ وہ میں نے پورے کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا۔ اور اللہ سے یہی دُعا مانگنی چاہیے کہ اس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو۔ اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول فرمالے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اس پر تھا۔ وہ اس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی مخلوق ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمت دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان اللہ کی راہ میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" اس طرح جب انہیں کوئی فتح نصیب ہو، اسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں۔ اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔

